وقت سمندر

محمد منشا یاد

وقت سمندر

افسانے

محمد منشا یاد

اپنا اپنا کاگ

اس سے پہلے میرا ارادہ نہیں تھا۔

لیکن اب' اس واقعہ کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چلا ہی جاؤں۔

وہاں اگرچہ وہ میرے ساتھ نہیں ہوگا لیکن اس کی کہانی میرے ہمراہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں اب بھی مائیں سونے سے پہلے اپنے بچوں کو اس کی کہانی ضرور سناتی ہوں گی اور وہ صبح اٹھ کر اپنے اپنے کاگ کو منڈیروں پر بولتے اور کلول کرتے دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے۔

میری اس کی دوستی بھی تو کہانی ہی کی بدولت ہوئی تھی۔

ماں جی نے بتایا تھا کہ ایک روز اس نے چڑیا کے ساتھ مل کر کھچڑ پکایا۔ چڑیا دال کا دانہ لائی اور وہ چاول کا۔ کھچڑ پک گیا تو چڑیا پوری ہانڈی چٹ کر کے چکی کے نیچے چھپ گئی۔ پھر جب اس نے بونڈا جلایا تو چیخنے چلانے لگی۔

''ہائے ہائے میرا بونڈا سڑیا۔۔۔۔۔۔۔ کیوں پرایا کھچڑ کھادا''

ماں جی کہانی سناتیں تو میں چڑیا کی چیخیں سن کر زور زور سے ہنستا' روند مارنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ان کو سزا ملتی ہے تو سب خوش ہوتے ہیں۔ مجھے چڑیا سے ذرا ہمدردی نہ ہوئی بلکہ کوے سے میری دوستی ہوگئی۔

پھر ایک مرتبہ ایک کوے نے جھپٹا مار کر میرے ہاتھ سے روٹی چھین لی۔ مجھے بہت برا لگا مگر میں نے سوچا یہ کوئی دوسرا کوا ہوگا۔ کہانی والا کوا تو ایسا ہرگز نہیں تھا۔ پھر میں سکول جانے لگا اور میں نے ایک نظم پڑھی۔

''ایک کوا پیاسا تھا۔۔۔۔۔۔۔ جگ میں تھوڑا پانی تھا''

اس نے پانی کی سطح بلند کرنے کے لیے جو ترکیب نکالی وہ مجھے بہت پسند آئی اور میں عش عش کر اٹھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ وہی میرا اپنا کاگ ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اتنے بہت سے کوؤں میں اسے کیسے پہچانوں۔ دیکھنے میں سب ایک جیسے تھے۔ ایک جیسے کالے پر۔ لمبی نوکیلی چونچ اور ایک جیسی کائیں کائیں۔ مگر ایک روز اس کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ ہوا یوں کہ ماں جی کہنے لگیں:

''جا دوڑ کر دکان سے سوجی لے آ۔ شاید آج تیرے ماموں آ جائیں۔''

ماموں جان کے آنے کی خبر سن کر مجھے خوشی تو ہوئی اور میں بھاگم بھاگ سوجی لینے بھی چلا گیا لیکن دل کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ماموں جان واقعی آ جائیں گے۔ ماں جی تو روز ہی کہتی تھیں آج آ جائیں گے۔ تاہم یہ سوچ کر ڈھارس بندھی کہ ماں جی انتظار تو روز ہی کرتی تھیں مگر انہوں نے سوجی آج ہی منگوائی تھی۔ ضرور انہیں اس کی اطلاع ملی ہو گی۔

دن بھر میرے کان دروازے پر لگے رہے۔ کئی بار چھت پر چڑھ کر بھی دیکھا مگر ماموں نہیں آئے۔ دل بیٹھنے لگا۔ مجھے ماں جی پر ترس آ رہا تھا جو اتنی سخت گرمی میں چولہے کے پاس بیٹھی حلوہ پکا رہی تھیں۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی اچانک ماموں کی گھوڑی کے ہنہنائے کی آواز سنائی دی۔ ماں جی ننگے پاؤں دروازے کی طرف دوڑیں۔

''بسم اللہ میرا ویر۔''

مجھے یقین ہو گیا کہ ماموں جان نے کسی کے ہاتھ اپنے آنے کی اطلاع بھیجی ہو گی جس کی وجہ سے ماں جی کو ان کے آنے کا پتہ تھا۔ مگر جب رات کو میں ماموں جان کی لائی ہوئی چھوٹی سی ٹارچ سے جگنوؤں کی نقلیں اتار رہا تھا۔ ماں جی نے بتایا کہ ان کو ماموں جان کے آنے کی خبر منڈیر پر مسلسل بولتے رہنے والے کوے سے ملی تھی۔ میں بہت حیران ہوا کہ کوے کو کیسے پتہ چلا کہ میرے ماموں جان آنے والے ہیں لیکن پھر سوچا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ ماموں جان کی گھوڑی تو راجباہ والے لمبے راستے سے چکر لگا کر آئی تھی اور وہ کھیتوں، درختوں اور تالابوں کے اوپر سے اڑتا ہوا بہت پہلے پہنچ گیا اور اس نے آ کر اپنی بولی میں اطلاع دے دی کہ کھانے کا انتظام کر لیں مہمان آنے والا ہے۔ مجھے اس کوے پر بہت پیار آیا اور میں اسے تلاش کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اگلی صبح اپنا انعام لینے ضرور آئے گا۔ اس لئے میں جلدی جاگا۔ دیکھا تو وہ سچ مچ منڈیر پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

ماں جی دودھ بلو رہی تھیں۔ میں نے روٹی کا ٹکڑا تلاش کیا اور مکھن سے چپڑ کر اس کی طرف پھینکا جسے اس نے راستے ہی سے اچک لیا اور میری اس کی دوستی پکی ہو گئی۔

میں گاؤں کے سکول سے پڑھ کر شہر چلا گیا تو وہ بھی وہاں آ گیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے شیشم کے درخت پر بیٹھا رہتا۔ میں کھانا کھانے لگتا تو اڑ کر قریب آ جاتا۔ جب کبھی میں گاؤں جاتا وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر ماں جی کو میرے آنے کی خبر کر دیتا۔ ماں جی اسے چوری کھلاتیں۔ دل زیادہ اداس ہوتا تو دودھ ملائی سے اس کی تواضع کرتیں۔

پھر میں گاؤں سے اور دور بڑے شہر میں چلا گیا۔ پہلے کالج اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ مگر اس نے کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں کلاس سے باہر آتا تو وہ کسی کھڑکی کے چھجے یا درخت پر بیٹھا ہوتا۔ کیفے ٹیریا کی منڈیر پر بیٹھا میری طرف دیکھتا رہتا۔ میں اپنے

ساتھ لڑکوں لڑکیوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس کے لئے ایک آدھ بسکٹ یا سینڈوچ کا ٹکڑا چھپالاتا۔ میرا جی چاہتا وہ میرے کندھوں پر آ بیٹھے۔ میرے ساتھ باتیں کرتے۔ میں جس جگہ بیٹھ کر کھانا کھاؤں یا چائے پیوں وہ میرے ساتھ میز پر بیٹھے اور میرے کھانے کی پلیٹ سے چونچ بھر بھر کر کھائے۔ ماں کو میرے خط اور مجھے ان کے سندیسے پہنچائے۔ مگر وہ ہر وقت بدکتا رہتا۔ اتنی پرانی اور پکی دوستی کے باوجود ذرا سا اعتبار نہ کرتا۔ میں آگے بڑھتا تو وہ پھر سے کسی اونچی ڈال پر جا بیٹھتا۔

پوہ ماگھ کی راتوں میں جب سخت سردی پڑتی' ہیٹر کے قریب بیٹھ کر پڑھتے ہوئے یا گرم ریشمی رضائی میں لیٹے لیٹے مجھے اس کا خیال آ جاتا تو میں پریشان ہو جاتا۔ پتہ نہیں وہ کہاں کسی درخت کے پتوں میں چھپ کر بیٹھا سردی سے کانپتا ہو گا۔ بار بار پروں میں سے چونچ نکال کر اس طرف کو دیکھتا ہو گا۔ جدھر سے سورج نکلتا ہے۔

جب کبھی رات کو بارش ہوتی مجھے بار بار اس کا خیال آتا۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہو۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے کمرے میں اس کا قوم کا آہلنا بنوا دیتا میں نے بارش اور جاڑے کی اتنی راتیں اس کی فکر میں گزاریں کہ بعض اوقات مجھے لگتا' میں نے ایسی ہر رات خود اس کے ساتھ کسی درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر گزاری ہے۔

ایک مرتبہ جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آیا ہوا تھا اس نے کمال کر دیا۔ صبح ہوتے ہی بولنے لگ گیا۔ میں دو ایک روز پہلے ہی باری باری سب رشتہ داروں سے مل کر لوٹا تھا اور کسی مہمان کے آنے کی توقع نہ تھی نہ انتظار۔ لیکن ماں جی کہنے لگیں:

"کو یوں ہی نہیں بول رہا ضرور کوئی آنے والا ہے۔"

میں نے کہا:

"کون آئے گا ماں جی یہ بھوکا ہے اس لئے یونہی بیملیاں مار رہا ہے۔"

لیکن شام کو جب ہمارے گھر کے سامنے تانگہ آ کر رکا تو میں ششدر رہ گیا۔

یوں لگا جیسے کوئی خوشیوں سے بھرا ریڑھا ہمارے دروازے پر الٹ گیا ہو۔ تانگے میں سے ناہید اور اس کے ڈیڈی اترے اور میرا اندر کا بچہ خوشی سے قلقاریاں مارنے اور تالیاں بجانے لگا۔ میرا جی چاہا کسی بڑے آرکیٹیکٹ سے ڈیزائن کروا کر گاؤں کے ہر درخت پر اس کا خوبصورت آہلنا بنوا دوں۔ دوسرے روز میں نے ناہید سے اس کا ذکر کیا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

میں جس کسی سے اس کا ذکر کرتا وہ ہنس دیتا۔ آخر میں نے اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اس کے ساتھ میری دوستی پختہ ہو گئی۔ میں اس کی خاطریں کرتا اور وہ میرے مہمانوں کی خبریں لاتا لے جاتا رہا۔

پھر میں نے شہر میں ملازمت کر لی۔

ناہید سے میری شادی ہو گئی۔

ماں جی ایک عرصہ تک اسے چوری کھلاتی رہیں پھر ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

میرے بالوں کا رنگ سفید ہو گیا۔

بچے بڑے ہو گئے۔

مگر میری اس کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔

ہم نے شہر میں بنگلہ بنوایا تو اس نے بھی عقبی باغ میں ٹھکانہ تلاش کر لیا۔ سارا دن گھر کی دیواروں، منڈیروں اور درختوں پر کائیں کائیں کرتا رہتا۔ میں کئی مرتبہ اسے بھول جاتا مگر اس نے کبھی ہمارا گھر نہ چھوڑا۔ کبھی کبھی چھٹی کے دن میں اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لے کر باغ میں آ جاتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیتا۔ سب مل کر شور مچاتے۔ بڑا ہنگامہ رہتا۔ بہت مزہ آتا۔

بچے اور بڑے ہو گئے۔

میں ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔

ناہید ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

بہت کچھ اوپر نیچے ہو گیا۔ مگر اس نے دوستی نہ توڑی۔ جب کسی پرانے رفیق یا عزیز رشتہ دار کو آنا ہوتا وہ گھر کے کسی درخت یا منڈیر پر بیٹھ کر دیر تک اونچی آواز میں بولتا رہتا۔

پھر بیٹیاں اپنے گھروں والی ہو گئیں۔

بیٹوں کے نصیب جاگے اور معصوم قلقاریوں سے گھر بھر گیا۔

میں ہر روز صبح سویرے باغ کی سیر کے لئے جاتا۔

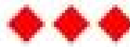
وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے سارے باغ میں اڑانیں لیتا۔ گھر آتا تو وہ مجھ سے پہلے آ کر منڈیر پر بیٹھا ہوتا۔

پچھلے کچھ مہینوں سے میرے بیٹوں اور بہوؤں کو بنگلہ چھوٹا معلوم ہونے لگا ہے اور انہیں گاؤں والی زمین اور مکانوں کی فکر ستانے لگی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے گاؤں جا کر اپنے آبائی مکان کو آباد اور زمینوں کی نگرانی کرنی چاہئے۔ وہ مختلف طریقوں اور حیلوں بہانوں سے مجھے آمادہ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ چلا جاؤں مگر اپنے میں بچوں کی رونق چھوڑ کر گاؤں میں

تنہا رہنے کا حوصلہ نہ پاتا۔

اور کوئی فیصلہ نہ کرسکتا۔ مگر پرسوں رات جو طوفان آیا تھا اس نے میرا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ یہ نہایت سخت طوفان تھا۔ میری غلطی سے طوفان کی سمت کی کھڑکیاں کھلی رہ گئیں تھیں جن کے رستے باہر کا طوفان گھر کے اندر گھس آیا اور گھر کی بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں اس کی نذر ہو گئیں۔ نصف رات تک طوفان کے جھکڑ چلتے رہے۔ جس میں میری چھوٹی بہو اور بڑے بیٹے کی بلند آوازوں کا شور بھی شامل تھا۔ باقی نصف رات گزشتہ کوتاہیوں کا شمار کرنے اور طوفان میں بہہ جانے والی چیزوں کا حساب کرنے میں گزاری۔ مجھے بار بار اس کا خیال آتا۔ ایسے شدید جھکڑوں اور خوفناک آوازوں کے طوفان میں پتہ نہیں اس کا کیا حال ہوگا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں اس کی خیریت جاننے کے لئے باغ میں گیا۔ وہاں' چاروں طرف بے شمار کوے کائیں کائیں کرتے پھرتے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا اور پریشان ہو گیا۔ ایک کوا گزشتہ رات کے طوفان سے مرا پڑا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی کوا تھا۔ میرا بچپن کا ساتھی۔ میرے ننھیال اور ماں کی کے میکے سے سندیسے لانے والا۔ میرے رفیقوں اور پیاروں کی آمد کی خبر دینے والا۔ ماں جی کی سنائی ہوئی چڑیا اور کوے کی کہانی والا کاگ!

اس سے پہلے میرا ارادہ نہیں تھا لیکن اب اس واقعہ کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چلا ہی جاؤں۔ وہاں اگرچہ وہ میرے ساتھ نہیں ہو گا لیکن اس کی یاد میرے ہمراہ ہو گی مجھے یقین ہے کہ وہاں اب بھی بڑی بہنیں اپنے ویروں' مائیں اپنے جگر گوشوں اور بڑی بوڑھیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کو سونے سے پہلے اس کی کہانی ضرور سناتی ہوں گی اور وہ صبح اٹھ کر اپنے اپنے کاگ کو منڈیروں پر بولتے اور کلول کرتے دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے۔



دام شنیدن

انہیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے۔
دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے یعنی ویجی ٹیرین ہیں ان کے پاس گوشت نہ کھانے کی اپنی اپنی وجوہات ہوں گی۔ ہوسکتا ہے بعض لوگ کسی عقیدے کی بنا پر گوشت نہ کھاتے ہوں۔ بعض کو ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہو کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کا نفسیاتی مسئلہ ہوگا۔ مثلاً میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا بچپن میں ایک بار زکام بگڑ گیا تھا اور اسے ہر چیز سے مردار کی بو آتی تھی۔ ایسے میں اسے گوشت کی یخنی پلائی گئی تو اسے قے ہوگئی کیونکہ اسے اس میں سے مردار کی بو آئی حالانکہ یہ بو اس کے اپنے اندر پیدا ہو گئی تھی مگر اس کا دل اس روز سے ہمیشہ کے لیے گوشت سے پھر گیا۔
لیکن میرا معاملہ بالکل مختلف ہے میں بچپن سے اب تک گوشت خوری کا شوقین رہا ہوں اور بھنا ہوا گوشت تو میری محبوب ترین غذا رہا ہے اور حالانکہ خون میں یورک ایسڈ کی مقدار زیادہ ہو جانے کی وجہ سے مجھے کئی بار ڈاکٹروں نے اس سے پرہیز بتایا اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔ مگر میں ان کی ہدایات پر کبھی پوری طرح عمل نہ کر سکا۔ مگر اب میں نے کچھ عرصہ سے گوشت خوری بالکل ترک کردی ہے۔ تاہم اس کی وجہ عقیدے کی تبدیلی نہیں بلکہ اس کا عقیدے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ میں عام طور پر اس کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ شاید کسی کو یقین نہ آئے۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ مجھے اصل بات بتا ہی دینی چاہئے تاکہ میرے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔
مجھے بچپن ہی سے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا اور میں نے چند ایک زبانیں سیکھیں تھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا جانوروں اور وہ بھی بھیڑ بکریوں کی زبان سیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے بس اتفاق اور میری بدقسمتی ہی سمجھئے کہ میں یہ زبان بلاارادہ سیکھ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک زمانے میں ہم گاؤں میں رہتے تھے جہاں ہمارا گھر تھا وہاں پچھواڑے میں بھیڑ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ میں رات کو دیر تک سکول کا کام کرتا اور جاگتا رہتا اور بھیڑ بکریوں اور ان کے میمنوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ دو ایک بار اندھیری رات میں بھیڑیا باڑے میں گھس آیا اور ایک آدھ بھیڑ اٹھا کر لے گیا۔ جس کے بعد بھیڑ بکریاں اور میمنے ہر وقت ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہنے لگے۔ خصوصاً گرمیوں کی تاریک راتوں میں بھیڑیوں کے خوف سے بھیڑ بکریاں رات رات بھر ممیاتی رہتیں۔ میں لیمپ بجھا کر سونے کی

کوشش کرتا مگران کی آوازیں اور سرگوشیاں مجھے سونے نہ دیتیں پھر پتہ نہیں کیسے خودبخود ان کی زبان میری سمجھ میں آنے لگ گئی۔ رات بھر میمنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے:

''ماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ماں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''ماں دن کب نکلے گا؟''

''ہائے مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

اور ہر ماں کی طرح ان کی مائیں بھی انہیں جھوٹی سچی تسلیاں دیتی رہتیں۔

ایک دفعہ ابا کو پتہ نہیں کیا بیماری لگ گئی۔ حکیم صاحب نے انہیں گولیاں دیں اور ہدایت کی کہ وہ ان کو بکری کے دودھ کے ساتھ ایک عرصہ تک استعمال کریں کچھ روز تو ابا پڑوس والوں سے دودھ مانگتے رہے پھر انہوں نے دودھ دینے والی ایک بکری خرید لی۔ جس کے ساتھ دو ننھے منے گتھے میمنے بھی تھے ایک کالا دوسرا ڈب کھڑبا۔ اس طرح مجھے بکروں کے زیادہ قریب رہ کر ان کی زبان سیکھنے کا موقع مل گیا۔ میمنوں سے میری گہری دوستی ہوگئی۔ میں سکول سے واپس آ کر دیر تک ان سے کھیلتا رہتا انہیں اپنے قاعدے اور کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ پڑھ کر سناتا۔ شام کو انہیں اپنے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں لے جاتا ان کے لئے درختوں سے ٹہنیاں کاٹتا وہ درختوں کے پتے کھاتے رہتے میں پہاڑ یاد کرتا رہتا' پتے کھاتے' گھاس چرتے اور پہاڑ یاد کرتے ہم آپس میں باتیں بھی کرتے رہتے رات کو وہ اپنی ماں کو دن بھر کی سیر اور کھیل کود کی تفصیل بتاتے اور دوڑنے' چھلانگیں لگانے' کھال اور گڑھے پھلانگنے' بلند ٹیلوں اور جھاڑیوں پر چڑھنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی ڈینگیں مارتے۔

''میں بڑا ہوگیا ہوں'' ایک کہتا۔

''نہیں میں اس سے بڑا ہوگیا ہوں'' دوسرا کہتا۔

بکری ان کے ہوشیار اور بڑا ہونے کی باتیں سن کر اداس ہوجاتی اور کہتی:

''کاش تم ہمیشہ چھوٹے ہی رہو' کبھی بڑے نہ ہو۔''

ان دونوں کی سمجھ میں بالکل نہ آتا ماں ایسا کیوں سوچتی اور کہتی تھی۔ وہ برا مان جاتے اور دیر تک اس سے روٹھے رہتے۔ میں نے بھی انہیں بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ان کے بڑے ہونے پر کس قسم کے حالات پیدا ہوسکتے ہیں۔

پھر ایک دن ڈب کھڑبا گم ہوگیا۔ہم نے بہت ڈھونڈا مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔بکری کئی روز تک اسے یاد کر کے چلاتی اور ممیاتی رہی۔میں اور کالا بھی اسے یاد کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ بھول گئے۔

کالا اب اور بڑا ہو گیا تھا۔اس کے سینگ بڑے اور نوکیلے ہو گئے تھے اور اس کے جسم سے بڑے بکروں جیسی بو آنے لگی تھی۔ بڑے بوڑھے اکثر اس کا منہ کھول کر اس کے دانت دیکھتے۔میرے ہم عمر لڑکے اسے دیکھ کر ڈر جاتے حالانکہ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر گھومتا رہتا۔ہم ایک دوسرے کی زبان ہی نہیں اشارے بھی سمجھتے تھے۔میں اسے جہاں بلاتا وہ دوڑ کر پہنچ جاتا۔ جس بات سے منع کرتا منع ہو جاتا میں جدھر جاتا وہ میرے پیچھے پیچھے آجاتا۔مجھے دور سے پہچان لیتا۔میری خوشبو سے مجھے جان لیتا۔ لیکن ایک روز بڑا دلچسپ واقعہ ہو گیا۔

وہ میرے مغالطے میں شیفو نائی کے پیچھے چل دیا۔شیفو بے چارہ گھبرا گیا۔وہ جدھر جاتا جس قدر تیز بھاگتا کالا بھی اس کے پیچھے دوڑتا آتا خوف سے تھر تھر کانپتا شیفو بڑی مشکل سے جان بچا کر گھر پہنچا۔اس کی ماں شکایت لے کر آئی کہ آپ کے بکرے نے مارنے کے لئے دور تک میرے بیٹے کا پیچھا کیا ہے۔شیفو کی ماں چلی گئی تو میں نے بکرے سے استفسار کیا اور یہ جان کر میری ہنسی چھوٹ گئی کہ شیفو نے اس روز اسی رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی جیسی میری تھی۔اور کالا یہ سمجھتا رہا کہ وہ میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بکرے نے بھی اس واقعے پر ہنسنا چاہا مگر کوشش کے باوجود نہ ہنس سکا اور دیر تک اس بات پر اداس رہا کہ اسے ہنسنا نہیں آتا تھا۔لیکن اگلے روز یہ معلوم کر کے کہ اس کی ماں سیم نالے کے پل سے گر کر زخمی ہو گئی تھی اور اسے ذبح کیا جا رہا تھا ہم دونوں سخت پریشان ہو گئے۔میں اسے دیر تک تسلی دیتا اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ میں نے بھی اس کی ماں کا گوشت مزے لے لے کر کھایا ہے تو مجھ سے بدکنے لگا۔اور کئی روز تک میرے قریب آنے سے ہچکچاتا رہا۔میں اسے پیار کرنے لگتا تو وہ سمجھتا میں دانتوں سے اس کی بوٹی نوچنے لگا ہوں۔میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں آدمی ہوں بھیڑیا نہیں۔ہم آدمی زندہ جانوروں کو نہیں کھاتے' کھانے سے پہلے انہیں مار لیتے ہیں' کچا نہیں چبا جاتے۔چبانے سے پہلے آگ پر بھون لیتے ہیں۔پھر آہستہ آہستہ کچھ دنوں بعد اس کا خوف کم ہو گیا اور وہ مجھ پر پہلے کی طرح اعتماد کرنے لگا۔

میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا اور شہر کے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا تو وہ بہت اداس ہو گیا۔مجھے بھی اس سے بچھڑنے کا بہت افسوس تھا مگر مجبوری تھی۔

بڑی عید کی چھٹیوں میں میں خوش خوش گاؤں واپس آیا۔لیکن یہ جان کر میری ساری خوشی کافور ہو گئی کہ اس بار عید پر اس کی قربانی

دی جارہی ہے۔ میں نے گھر میں ہر ایک کی منت سماجت کی کہ وہ میرے کالے کو چھوڑ دیں اور قربانی کے لئے کوئی دوسرا بکرا یا دنبہ خرید لیں۔ مگر میری ایک نہ چلی۔ کالے کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ میں نے بھی اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا وہ خوش خوش میرے ساتھ دوڑتا پھرتا۔ چھلانگیں لگاتا۔ اونچے پیڑوں کے تنوں سے چمٹ کر پتے نوچتا اور میری ٹانگوں سے سینگ رگڑ رگڑ کر اظہار محبت کرتا۔ مگر جب اسے لٹا کر چھری چلا رہے تھے تو اس نے گھبرا کر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ میں اسے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے اپنے کمرے میں چھپ گیا تھا۔ مگر اس کی چیخ پکار مجھے سنائی دے رہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں آ کر اسے بچا لوں گا اس لئے آخری وقت تک مجھے پکارتا رہا اور فریاد کرتا رہا مگر میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا میں احتجاج کے طور پر کم از کم اس کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر جب گوشت پک کر میرے سامنے آیا تو اس کی خوشبو سونگھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے سب کچھ بھول کر بوٹیاں کھانا شروع کر دیں۔

اس کے بعد میں نے کبھی کسی بکرے یا پالتو جانور سے دوستی نہیں کی۔ ہر بقرعید پر ہمارے ہاں دنبہ یا بکرا آتا اور ذبح ہوتا رہا لیکن میں کوشش کرتا کہ ان سے دوستی یا محبت نہ ہو۔ ورنہ زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ ابا کا خیال تھا' جانور سے جتنی زیادہ مانوسیت اور محبت ہوتا اتنا ہی زیادہ ثواب ملتا ہے۔ لیکن میں کوشش کے باوجود خود میں اتنی ہمت نہ پاتا۔ چنانچہ جب قربانی کا وقت آتا میں عید ملنے کے بہانے کسی رشتہ دار یا دوست کے ہاں چلا جاتا اور اس وقت گھر آتا جب بکرا یا دنبہ کٹ چکا ہوتا۔ ابا کہتے تھے اس سے ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن میں ایمان کو کمزور نہیں پڑنے دیتا تھا۔ کٹے ہوئے بکرے یا دنبے کو مزید کاٹنے' بوٹیاں چیرنے اور خویشوں اور درویشوں میں تقسیم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھبراہٹ اور کمزوری کا اظہار میں صرف اسی وقت تک کرتا تھا جب تک بکرا یا دنبہ زندہ ہوتا اور دیکھ' سن' بول اور محسوس کر سکتا۔ ہاں مجھے سری سے بہت ڈر لگتا۔ میں قصاب کی دکان پر بھی بکرے یا دنبے کی سری دیکھتا تو اس کی بے جان آنکھوں کا سامنا نہ کر سکتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مجھ پر گڑی ہوں اور کچھ کہہ رہی ہوں۔ میری یہ کوشش بھی ہوتی کہ میں کسی بکرے کو پتہ نہ چلنے دوں میں اس کی زبان جانتا ہوں میں نے گھر والوں اور جاننے والوں سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ میں بکروں کی زبان جانتا ہوں۔ لیکن ان کی زبان جاننے سے خاصی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ بعض اوقات مجھے لگتا میں اندر سے بکرا بنتا جا رہا ہوں۔

گھر والوں نے کئی بار اصرار کیا کہ عید کی قربانی میں خود کروں اپنے ہاتھ سے بکرے کے گلے پر چھری چلاؤں کیوں کہ ایسا کرنا سنت ہے۔ مولوی صاحب نے بھی مجھے سمجھایا اور بتایا کہ ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں خون بہانے کا جذبہ اور جرات

پیدا ہوتی ہے اور آدمی جہاد میں حصہ لینے کی تربیت پاتا ہے۔ لیکن میں کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ ذبح ہونے سے پہلے بکرے جس طرح آہ و بکا کرتے ہیں اسے صرف میں ہی سن اور سمجھ سکتا ہوں اور صرف مجھے ہی اس بات کا اندازہ ہے کہ کسی ہم زبان کو ذبح کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں عام آدمی کسی ہم زبان اور ہم جنس کو قتل تو کر سکتا ہے ذبح نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے پیغمبر کا دل اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ انہیں بھی آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑتی ہے مجھے اکثر خیال آتا کہ کاش مجھے بکروں کی زبان نہ آتی ہوتی اور میں اس قدر بزدل نہ ہوتا۔ بہر حال اگر چہ اسے ایمان کی کمزور پر محمول کیا جاتا تھا مگر میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو ذبح نہیں کروں گا۔ لیکن پچھلے سال میں اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔

ہوا یوں کہ بہت سی دعاؤں اور منتوں کے بعد میرے گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے بیٹا پیدا ہو گیا۔ بہت خوبصورت اور بالکل میمنے کی طرح پیارا۔ ابا نے فوراً عقیقے کے لئے دو بکرے منگوا لئے۔ شہر میں ایک عرصہ سے رہتے رہتے اب بکروں سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی اور گفتگو سے تو میں خود بھی گریز کرتا تھا۔ لیکن عقیقے کے دونوں بکرے کئی روز تک میرے کمرے کی کھڑکی کے قریب صحن میں بندھے رہے۔ خیال تھا کہ جمعرات کو عقیقہ کیا جائے۔ لیکن آپا کو سسرال سے آنے میں دیر ہو گئی۔ شاید ان کا کوئی جیٹھ یا دیور بیمار تھا اس دوران میں دونوں بکرے رات کو جگالی کرتے ہوئے عجیب و غریب گفتگو کرتے رہتے۔ پتہ نہیں انہیں کیسے اپنے انجام کی خبر ہو گئی تھی۔ چھوٹا بہت خوفزدہ تھا۔ ایک رات کہنے لگا۔

''ذبح کس طرح کرتے ہیں؟''

''زمین پر لٹا کر چھری چلا دیتے ہیں'' بڑے نے کہا۔

''تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی؟''

''ہاں میں نے ایک بار دیکھا تھا بڑی دیر تک جان نکلتی رہتی ہے۔''

''ذبح کیوں کرتے ہیں؟''

''کھانے کے لئے۔ ان کے منہ میں بھی بھیڑیے کے دانت ہوتے ہیں۔''

''میری تو ڈر کے مارے ابھی سے جان نکلنے لگی ہے۔''

''ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔''

''کیا دونوں کو ایک ساتھ ذبح کریں گے؟''

''شاید باری باری''

''پہلے کون ذبح ہوگا؟''

''تمہیں زیادہ ڈر لگتا ہے اس لئے پہلے میں Œ''

''تمہیں ذبح ہوتے دیکھ کر تو میں گھبرا جاؤں گا' اس لئے پہلے میں Œ''

''نہیں میں!''

''نہیں میں!''

''میں میں میں!''

میں دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا پھر اٹھ کر کھڑکی بند کر دی گئی مگر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ میں دیر سے سو کر اٹھا۔ دیکھا تو گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پیاز چھیلے جا رہے تھے۔ مسالہ پیسا جا رہا تھا۔ تکوں' کوفتوں' اور بالٹی گوشت کا پروگرام بن رہا تھا۔ والد صاحب شاید قصائی کو بلانے گئے ہوئے تھے۔

کال بیل کی آواز سن کر میں باہر گیا تو پڑوس کی مسجد سے دینی مدرسے کا طالب علم لڑکا کھالوں کے بارے میں پتہ کرنے آیا تھا کہ اتری ہیں یا نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی نہیں اتری ہیں۔

''ابھی تک نہیں اتریں'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ذبح کئے بغیر کیسے اتار سکتے ہیں''

''ہاں جی۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے میں پھر آ جاؤں گا''

جب ذبح کرنے کا وقت آیا میں گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن ابا نے میرے ہاتھ میں چھری تھما دی اور اصرار کیا کہ میں اپنے ہاتھ سے ذبح کروں میں نے بہت کوشش کی مگر انہوں نے مجھے جانے نہ دیا۔

پہلے چھوٹے کو لایا گیا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور خوف سے ممیا رہا تھا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ میں نے کہا۔

''پہلے بڑے کو لاؤ''

بڑے کو لایا گیا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا پھر گھگھیائی ہوئی آواز میں چھوٹے سے مخاطب ہوا۔

''منہ دوسری طرف کو لو چھوٹے۔''

چھوٹے کا اپنی جگہ کھڑے کھڑے پیشاب خطا ہو گیا۔

مجھے اس کی رات والی بات یاد آئی۔ میں نے سوچا بڑے کو پہلے ذبح کیا تو وہ ہول سے مر جائے گا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''پہلے چھوٹے ہی کو لاؤ۔''

اصل میں میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پہلے کسے ذبح کروں۔ وہ چھوٹے کو لے آئے جب اسے لٹایا گیا تو اس نے زور سے ممیانا اور چیخنا شروع کر دیا۔

''ہائے میں مرا۔۔۔۔۔۔۔ہائے میں مراŒ''

''حوصلہ کرو' میرے منہ سے اچانک نکل گیا''تم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہو''

بکرے نے چونک کر گردن اٹھائی اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور چھری کے نیچے اپنی گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میں نے اللہ اکبر کہہ کر چھری چلا دی اور وہ حلال ہو گیا۔ مگر جب کھانے کا وقت آیا تو مجھے گوشت سے ویسی ہی بو آئی جیسی اپنے نومولود بیٹے سے آتی تھی۔ اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اس کے بعد میں کوشش کے باوجود کبھی گوشت کو چھو نہ سکا۔

اب انہیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے۔



دنیا کا آخری بھوکا آدمی

ایسا ہوتا ہے۔

ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آیا اور آپ نے سوچے سمجھے بغیر اپنے دفاع کے لئے اندر کے خسیس اور کمینہ خصلت منشی کو پکارنا شروع کر دیا اور جب منشی اور مہمان رخصت ہوئے آپ کو یاد آنے لگا کہ ضرورت مند شخص سے آپ کے کتنے دیرینہ یا گہرے تعلقات تھے۔ آپ پر اس کے کتنے احسانات تھے یا اس کی ضرورت کتنی جائز اور اہم تھی۔ اب آپ چاہتے ہیں اس کی تلافی ہو جائے مگر نہیں ہو پاتی کہ اس نے کسی اور ذریعے سے اپنی مشکل پر قابو پا لیا ہے اور آپ اب کف افسوس ملنے کے لئے رہ گئے ہیں۔

بس کچھ ایسا ہی ہوا۔

ہم ایک پر تکلف دعوت سے لوٹ رہے تھے' رات کے نو سوا نو بج رہے تھے۔ بازار میں زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر بکریوں' پان سگریٹ کے کھوکھوں' کھانے پینے کے اسٹالوں اور اوپن ایئر ریستورانوں پر ابھی تک رونق تھی۔

مجھے جمائیاں آ رہی تھیں مگر وہ ابھی تک تر و تازہ تھی کیونکہ اس نے خوبصورت لباس اور قیمتی زیور پہن رکھا تھا۔

گنجائش تو نہیں تھی لیکن آج کل شہر کے اس فیشن ایبل علاقے میں رات کو کاروں میں بیٹھ کر کھانا پینا' کھاتے پیتے لوگوں کا دستور ہے۔ خود کو اس طبقے میں اہل سمجھنے کے لئے ہمیں بھی یہ دستور نبھانا پڑتا ہے۔ میں نے اس کے لئے آئس کریم اور اپنے لئے کولڈ ڈرنک منگایا۔ اب صرف پان کی گنجائش رہ گئی تھی۔ میں پان لے کر لوٹا تو وہ تنکوں کی تین ٹوکیاں اٹھائے اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ منع کر رہی تھی اور وہ اصرار۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کوئی دخل نہ دیا۔ ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ دی اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بولی:

''اسے کچھ دے دیں کہہ رہا ہے بھوکا ہوں۔''

''کوئی بھوکا دو کا نہیں ہوتا۔'' میں نے ریورس گیئر لگایا۔ ''سب مانگنے کے بہانے ہیں۔''

گاڑی ریورس ہوئی۔ وہ پریشان ہو کر بولی:

''وہ رو رہا ہے۔''

میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ٹوکریاں زمین پر رکھے ننھے بچوں کی طرح روتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

''بڑے مکار ہوتے ہیں یہ۔۔۔۔۔۔۔فریبی۔''

میں نے یہ الفاظ نسبتاً بلند آواز مگر کھوکھلے لہجے میں کہے کیونکہ میں خود کو ڈھارس دینا چاہتا تھا۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ پچپن ساٹھ برس کے ایک بزرگ صورت شخص کو اس طرح بلکتے دیکھ کر میرے اندر بہت کچھ آپ ہی آپ ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسے کچھ دے سکتا تھا دینا چاہتا تھا لیکن اب گاڑی سڑک پر آ چکی تھی۔ آگے پیچھے بھاری ٹریفک تھا۔ پھر وہ کیا سوچتی میں اندر سے اتنا کمزور اور زود پشیمان ہوں؟ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے مجھے لگا زار و قطار روتا وہ بوڑھا ذہن سے چپک کر میرے ساتھ ہی چلا آیا ہے۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے اور ٹیلی ویژن کھولا مگر بند کر دیا۔ کتاب لے کر لیٹا مگر پڑھنے میں جی نہ لگا۔ بار بار بوڑھے کا آنسوؤں سے تر چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ کاش میں نے اسے روپیہ دو روپیہ دے دیا ہوتا۔ یہ الجھن تو نہ ہوتی۔

روپیہ۔۔۔۔۔۔۔جس کا میں نے پان چبا کر تھوک دیا تھا جسے میں سگریٹ کی صورت پھونک رہا تھا۔ جس کی قیمت کا سوڈا واٹر بوتل میں چھوڑ آیا تھا اور روپیہ۔۔۔۔۔۔۔جو میں نے ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ میں دے دیا تھا۔

کبھی خود پر غصہ آتا کبھی بوڑھے پر۔۔۔۔۔۔۔طرح طرح سے جی کو بہلانے کی کوشش کی کہ ضرور اس کا تعلق پیشہ ور بھکاریوں کے کسی گروہ سے ہوگا اور اب تک اس کی آنی گاڑی اسے لینے آ گئی ہوگی بلکہ اب تک وہ اپنی ڈیرے پر پہنچ کر دن بھر کی کمائی کا حساب لے یا دے رہا ہوگا۔ کیا پتہ وہ اس وقت کسی ریستوران میں بیٹھ کر چکن تکہ یا کڑاہی گوشت کھا رہا ہو یا چرد بھرے سگریٹوں کے کش لگا رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے آنسوؤں سے دھلا ہوا اس کا معصوم اور نڈھال چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا اور میں پریشان ہو جاتا۔

پریشانی سے بچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ میں واپس جاؤں اور اگر وہ بھوکا ہے تو اسے کھانے کے لئے کچھ پیسے دے آؤں یا اگر وہ کڑاہی گوشت کھا' یا سگریٹ پھونک رہا ہے تو اس پر لعنت بھیج کر واپس آ جاؤں اور مطمئن ہو کر سو جاؤں لیکن میں اپنی ہر کمزوری اس سے چھپاتا رہا۔ اس لئے میں نے کسی ضروری کام کا بہانہ کیا اور گیراج سے گاڑی نکال کر بازار کی طرف رواہ ہو گیا۔

جونہیں میں گلی کا موڑ مڑ کر سڑک پر آیا مجھے دور پہاڑیوں میں واقع اس کا چھوٹا سا گھر دکھائی دینے لگا جہاں اس کی بیماری بیوی کھاٹ پر لیٹی کھانس رہی تھی اور زرد رو بیٹی بیٹھی تنکوں کی ٹوکری بنا رہی تھی۔ اس کی بیٹی کو اپنے کام میں بڑی مہارت ہے اور را سے اپنی بنائی ہوئی ٹوکریوں پر بڑا ناز ہے مگر اسے شکایت ہے کہ قصبے کا دکاندار اچھے دام نہیں دیتا وہ ہر بار بابا سے کہتی ہے کہ وہ ٹوکریاں شہر لے جا کر بیچے اور دیکھے کہ بیگمات ان کی کتنی قدر کرتی ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بل کھاتی پہاڑی سڑک پر وہ شہر کو جاتی بسوں کو حسرت بھر

نظروں سے دیکھتا ٹوکریاں اٹھائے پیدل چل رہا ہے۔اس کا خیال ہے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی جگہ جگہ بیگمات کاریں روک کر ٹوکریاں دیکھنے کے لئے رک جائیں گی اور ہاتھ ہاتھ خرید لیں گی۔ پھر وہ بیوی کی دوائی' بیٹی کے کپڑے اور بکری کی گانی خرید کر بس پر سوار ہوگا اور اپنے گھر واپس چلا جائے گا۔مگر آج تیسرا روز ہے اور اس کی ایک بھی ٹوکری فروخت نہیں ہوئی شاید ان کا فیشن ختم ہو گیا ہے یا ڈیزائن پرانے ہو گئے ہیں وہ سڑکوں اور بازاروں میں ٹوکریاں اٹھائے بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا ہے۔میں نے بازار کے اس حصے میں جہاں تھوڑی دیر پہلے اسے روتا چھوڑ گیا تھا پہنچ کر گاڑی روکی۔ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔میرا خیال تھا کہ وہ یہیں کہیں آتی جاتی کاروں کے گرد منڈلاتا ہوگا۔لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔میرے دل کو دھچکا سا لگا۔میری پشیمانی کیسے دور ہوگی۔

میں نے بازار میں گھوم پھر کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ضرور وہ چھپ کر کسی ریستوران میں کھا پی رہا ہوگا۔اگر میں اسے کھاتے پیتے دیکھ لوں تو مجھے کس قدر سکون ملے۔دل میں چبھی ہوئی پھانس سی نکل جائے۔

ہوٹلوں اور ریستورانوں میں طرح طرح کے لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔گپ شپ کر رہے تھے۔میرے ذہن میں اس کی شکل نہیں تھی لیکن اتنا یاد تھا کہ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی تھی اور وہ پچپن ساٹھ برس کا ایک دیہاتی بوڑھا تھا جس کے پاس تین ٹوکریاں تھیں۔ میں نے ایک ایک ہوٹل میں جا کر اسے تلاش کیا۔لیکن وہ کہیں نہ ملا۔کئی بار ارادہ کیا کہ لوٹ جاؤں مگر مجھے اپنی طبیعت کا احال معلوم تھا۔ذرا سی الجھن بھی ہو تو جب تک اس پر قابو نہ پا لوں یا اس کا حل نہ سوچ لوں چین نہیں آتا۔میں نے اسے فٹ پاتھوں اور ملحقہ پارکوں میں سوئے یا سے جاگتے آدمیوں میں تلاش کیا۔ • ھر قریبی مسجدوں میں جا کر دیکھا۔رات کے بارہ بج گئے مگر اس کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا وہ ناکام واپس آؤں اور رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہوں۔

تو کیا وہ سچ مچ بھوکا تھا۔بغیر کچھ کھائے پیے سو گیا۔سویا کہاں ہوگا۔خالی پیٹ نیند کہاں آتی ہے۔بھرے پرے شہر میں بھوکا رہ کر وہ کیا سوچتا ہوگا۔یہ کتنی عجیب بات ہے کہ لذیذ کیک پیسٹریوں سے بھری بیکریوں' خوش ذائقہ مٹھائیوں سے اٹی دکانوں' اناج سے بھرے گوداموں اور رنگا رنگ پھلوں سے آراستہ فروٹ شاپس کے سامنے یا کہیں آس پاس آدمی بھوکا پڑا ہو۔

رات بھر عجیب واہیات اور مکروہ خواب دکھائی دیتے رہے۔کبھی میں دیکھتا' میں جس شخص کی برائیاں بیان کر رہا ہوں وہ عین میرے پیچھے کھڑا سن رہا ہے۔کبھی دیکھتا کہ میں نے ایک بچے سے ٹافی چھین کر ہڑپ کر لی ہے اور وہ میرے سامنے زار و قطار رو رہا ہے۔بار بار آنکھ کھلتی رہی۔عجیب ندامت بھری رات تھی۔

صبح دفتر جاتے ہوئے میں نے بازار کا ایک لمبا سا چکر لگایا' فٹ پاتھوں' دکانوں کے تھڑوں اور ملحقہ پارکوں پر نظر دوڑائی دفتر میں بھی بار بار مجھے اس کا خیال آتا رہا۔دفتر سے واپسی پر بھی میں نے بازار کا اس خیال سے چکر لگایا کہ شاید وہ کہیں دکھائی دے جائے

اور میں اسے روپیہ دو روپیہ دے کر اس خلش سے جنجات حاصل کرسکوں جو مجھے گزشتہ شب سے اندر ہی اندر بے چین کررہی تھی۔ لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ تاہم مجھے توقع تھی کہ شام کے بعد وہ ضرور اسی جگہ مل جائے گا جہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

میں نے شام ہونے کا بیتابی سے انتظار کیا اور کھانا کھائے بغیر ٹہلنے کے بہانے بازار کی طرف چل دیا۔ میں بڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گزشتہ رات والی جگہ کا چکر لگاتا مگر وہ نہ ملا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

بدبخت تیری اتنی عمر گزر گئی لیکن تجھے خبر نہ ہوئی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اخر تو اتنا عرصہ کرتا کیا رہا ہے؟ کہ اس زمانے میں بھی بھوکا سوتا ہے۔ جب اس موضوع پر شاعر نظمیں کہنا اور افسانہ نگار کہانیاں لکھنا ترک کرچکے ہیں۔ تیری زندگی میں کتنے ملک آزاد ہوئے کتنی نئی قومیں اور ملک معرض وجود میں آئے۔ کیا کیا ایجادات ہوئیں۔ کتنے علمی اور سائنسی انکشافات ہوئے۔ ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کیا۔ کلرک وزیر سفیر اور سپاہی جرنیل کرنیل بن گئے۔ دینو میراثی کا لڑکا پٹواری بن گیا۔ رحموں نائی کا بیٹا کلاس ون افسر لگ گیا۔ وسیم خاج راج گیری کرتا تھا اب اے کیٹیگری گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے۔ جمیل صاحب پروف ریڈنگ کرتے کرتے تھیٹ اب پرنٹنگ پریس کے مالک ہیں۔ بشیرا ریڑھی لگاتا تھا اب ہول سیل فروٹ مرچنٹ ہے۔ بدبخت بوڑھے صرف تو رہ گیا۔ اتنی تبدیلیاں آئیں اور تجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ ٹھیکے، پرمٹ، لائسنس، نیلام، الاٹمنٹیں، وظیفے۔ پتہ نہیں تو کس کھوہ میں چھپا رہ گیا۔ تو نے اپنے پہاڑوں سے اتر کر کبھی دیکھا ہی نہیں۔ تو نے دھوپ میں بال سفید کئے۔ ساری دنیا آگے نکل گئی صرف تم پیچھے رہ گئے۔ میرا سکون غارت کرنے کے لئے۔۔۔۔۔ لیکن تم اگر بھوک سے مرتے ہو تو مرو۔ میری بلا سے میری کیا ذمہ داری ہے اور کیا مجھ اکیلے کی ذمہ داری ہے۔

میں نے اسے اگلے روز اور اس سے اگلے روز بھی تلاش کیا۔ یقیناً وہ اپنے گھر واپس چلا گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں دل کو تسلی دینا چاہتا۔ لیکن ایک بوجھ سا تھا جو میں ہر وقت دل پر لئے پھرتا تھا۔ ایک بے چینی سے تھی۔ ایک خلش جو مجھے بے چین کرتی رہتی تھی۔

پھر ایک روز میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ ایک نامعلوم بوڑھا بس کے نیچے آکر کچلا گیا تھا اور حالانکہ خبر میں ٹوکریوں کا ذکر نہیں تھا۔ لیکن میں نے یقین کر لینے میں عافیت سمجھی کہ وہ وہی بوڑھا تھا۔ مجھے دکھ ضرور ہوا۔ لیکن اس رات میں چین اور سکون کی نیند سویا جیسے آخری بھوکا آدمی دنیا سے اٹھ گیا ہو۔



غروب ہوتی صبح

عجیب دورنغ بھری صبح طلوع ہوئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چل رہا وہ جاگ گیا ہے یا ابھی تک سو رہا ہے۔ اگر وہ سو رہا ہے تو سامنے والی خالی کھڑکی اسے کیسے نظر آ رہی ہے اور اگر وہ جاگ رہا ہے تو سے اپنے خراٹوں کی آواز کیسے سنائی دے رہی ہے۔ ان خراٹوں کے ساتھ ساتھ اسے ان شارکوں کا شور بھی سنائی دے رہا ہے جو اسے نظر تو نہیں آ رہیں مگر خالی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھی عجیب وغریب آوازیں نکال کر آپس میں اظہار محبت کر رہی ہیں یا شاید لڑ جھگڑ رہی ہیں۔ اچانک اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ گہرے پانی میں غوطے کھانے لگتا ہے عجیب کیفیت ہے وہ سوچتا ہے کہ وہ ڈوب بھی رہا ہے اور خود کو ڈوبتے ہوئے دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ ڈوب گیا تب بھی کچھ نہ کچھ بچ جائے گا۔ اسی لمحے آپس میں لڑتی جھگڑتی یا شاید چہلیں کرتی شارکوں میں سے ایک ایسی عجیب و غریب آواز نکالتی ہے جیسے ہنس رہی ہو۔ دوسری آہستہ سے کچھ کہتی ہے۔ پھر پہلی زور زور سے چلاتی ہے۔

''جھوٹ' جھوٹ' جھوٹ''

اس کے بعد دونوں میں سے کوئی جیسی بھی آواز نکالتی اور کچھ بھی کہتی ہے' دوسری زور زور سے چلانے لگتی ہے ''جھوٹ' جھوٹ' جھوٹ۔''

شاید اب اس کا ذہن کچھ کچھ بیدار ہو گیا ہے کہ خراٹوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی اسے یاد آتا ہے رات وہ دیر تک اپنے پسندیدہ گیتوں کا کسیٹ لگا کر سنتا رہا تھا' پڑوس سے نامانوس آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دباتا ہے مگر جونہی گیت ختم ہوتا ہے شارک کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''جھوٹ' جھوٹ' جھوٹ۔''

اس کے بعد وہ جو بھی گیت سنتا ہے۔ دونوں شارکیں یا ان میں سے کوئی ایک جھوٹ جھوٹ کی گردان کرنے لگتی ہے۔

وہ ٹیپ ریکارڈر بند کر دیتا ہے اور ریڈیو سے خبریں سنتا ہے۔ شارکیں اب بھی باز نہیں آتیں۔ وہ لیٹے لیٹے پاؤں کی ٹھوکر سے کھڑکی کا ٹ پٹ بند کر دیتا ہے۔ پٹ کے زور سے بند ہونے کی آواز سن کر شارکیں اڑ جاتی ہیں۔ اب ہنسنے کی اس کی باری ہے۔

تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ سگریٹ منہ میں لے کر سلگانے لگتا ہے مگر پھر اسے یاد آتا ہے کہ آج

چھٹی کا دن ہے اور باؤ جی ابھی تک گھر پر ہوں گے۔ سگریٹ کی خوشبو سے انہیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ اس نے سموکنگ پھر سے شروع کر دی ہے۔ کیا مصیبت ہے وہ جھنجھلا کر سوچتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سگریٹ بھی نہیں پی سکتا۔ گردن کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کر لیٹ جاتا ہے اور دن بھر میں پیش آنے والے واقعات اور اپنی مصروفیات کا جائزہ لیتا ہے۔ ابھی جب وہ نیچے جائے گا۔ اسے بیکری سے انڈے روٹی لانے کو کہا جائے گا پھر اسے قصائی کی دکان پر بھیج دیا جائے گا۔ مگر شاید آج نہیں کہ سب کا کھانا پڑوس والوں کے ہاں ہے۔ البتہ جب وہ ناشتہ کر رہا ہوگا تو ہر ایک کو اپنے اپنے کام یاد آنے لگیں گے۔ فلاں کے ہاں سے سلے ہوئے کپڑے لا دو فلاں کے گھر یہ پیغام دے آؤ۔ فلاں کو چھوڑ آؤ فلاں کو لے آؤ۔ وہ موٹروں' تانگوں' بسوں' رکشاؤں اور ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے سائیکل سواروں سے بچتا بچاتا بڑی مشکل سے ایک مہم سے واپس آئے گا تو اسے کدی دوسری مہم پر روانہ کر دیا جائے گا۔ اسے آج پہلی بار احساس ہو رہا ہے کہ وہ یہ مہمیں سر کرتے کرتے اکتا چکا ہے اسے لگتا ہے جیسے وہ ان سب کا بیٹا' بھائی' دیوار اور چچا نہیں زر خرید غلام ہے باؤ جی تو پھر باپ ہیں انہوں نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگر چہ کچھ احسان نہیں کیا۔ مگر حد یہ ہے کہ ان کے دوستوں کے دوست بھی اس پر حق رکھتے ہیں اور جب اور جہاں چاہتے ہیں اسے بیگار میں پکڑ کر بھیج دیتے ہیں' وہ جیب خرچ سے بچا کر چند لیٹر پٹرول موٹر سائیکل میں ڈلواتا ہے اور جب وہ ان کے میکے جاتا ہے تو بھابی کی بھابی اسے اپنی بھابی کے ہاں کسی کام سے روانہ کر دیتی ہے اور تو اور منی اور پپو بھی اس پر حکم چلا لیتے ہیں۔ چچا ہمیں سیر کرا دو۔ ہمیں چڑیا گھر لے چلو' ہمیں آئس کریم کھلا دو۔

اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ وہ دکھ سے سوچتا ہے۔ گھر ہو یا دفتر ہر جگہ اس کے بہت سے آقا موجود ہیں جو اسے اپنا غلام سمجھ کر احکامات جاری کرتے رہتے ہیں۔ اور جیسے اس کی اپنی وئی پسند یا مرضی نہ ہو اس کی اپنی کوئی شخصیت نہ ہو ہر کوئی اس پر اپنی پسند اور مرضی ٹھونسنا چاہتا ہے۔ گھر میں جو پکا ہے وہ کھانا پڑتا ہے جو دوسرے چاہیں وہ کرنا پڑتا ہے۔ دفتر کے جیسے بھی ضابطے ہوں یا ان میں کیسی بھی ترامیم ہوتی رہتی ہوں اسے موسٹ اوبیڈنٹ سرونٹ بن کر ان کی تعمیل کرنا پڑتی ہے تو کیا وہ دوسروں کے احکامات بجالانے اور ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے پیدا ہوا ہے خود اس کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں! اسے کسی بات کا اختیار نہیں! افسوس اس نے آج سے پہلے کبھی اس پر غور نہیں ہونے دے گا۔ وہ انہیں بتائے گا کہ اس کی آذنی آزاد اور خود مختار شخصیت ہے اور کسی کو اس کی آزادی سلب کرنے کا کوئی حق نہیں وہ چونکتا ہے منی اخبار لے کے اندر آتی ہے اور تپائی پر رکھ کر چلی جاتی ہے وہ اخبار اٹھا کر شہ شرخی پڑھتا ہے۔ شاید شار کیں کہیں پڑوس کے کسی چھجے پر جا بیٹھی ہیں دور سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

”جھوٹ' جھوٹ' جھوٹ۔“

وہ اخبار اٹھا کر ای طرف رکھ دیتا ہے اور سگریٹ سلگا کر پینے لگتا ہے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ہو اپنے بہت سے آقاؤں سے بغاوت کا علم بلند کر دیا ہو اسی لمحے سامنے کے مکان کے چھجے پر ایک موٹا تازہ کوا آ بیٹھتا ہے اور بلند آواز سے کہتا ہے۔

''دروغ''

وہ اٹھ کر کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی بند کر دیتا ہے۔ پٹ بند ہونے کی آواز سے کوا اڑ جاتا ہے لیکن اسے لگتا ہے جیسے وہ چھجے سے اڑ کر اس کے اندر کی کیس منڈیر پر آ بیٹھا ہو اور اس کی ہر بات اور سوچ پر دروغ دروغ کی رٹ لگا کر اپنی پھیرنے لگا ہو۔

تب بھابی اندر آتی ہیں اور ایک نظر اسے دیکھ کر کمرے میں بکھری چیزوں کو ٹھیک کرنے لگتی ہیں' وہ اخباروں میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ کہتی ہیں ''اچھا ہوا تم جلدی اٹھ گئے ناشتہ کر کے مجھے آپا کے ہاں سے کپڑے لا دو انہوں نے ٹانک دیئے ہوں گے؟''

اس کا جی چاہتا ہے وہ ان سے پوچھے کہ کپڑے کس کے ہیں؟ لیکن پھر اسے خیال آتا ہے کہ جب اسے لا کر دینے ہی نہیں ہیں تو اسے اس سے کیا غرض کہ کپڑ بھابی کے اپنے ہیں یا انہوں نے پڑوس والوں کے لئے بنائے ہیں۔

''بھابی آپ کسی اور سے منگوا لیجئے مجھے آج ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے''

''ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا ہے تجھے آج کے دن؟''

''کیوں آج کیا ہے۔''

''آج۔۔۔۔۔۔۔تمہیں پتہ ہے بھیا۔ آج کیا ہے۔ پڑوس میں تمہاری ضرورت ہو گی۔''

''میری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔''

''پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ محلے داری ہے آخر۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ رکھائی سے کہتا ہے' آج مجھے فراغت نہیں۔''

بھابی کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر کہتی ہیں:

''تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو اور خود غرض بھی''

''کیا مطلب؟''

''ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اور بے چاری عورت۔''

''پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ رات تمہارے بھائی جان کے سر میں درد تھا۔ ساری رات خود سوئے نہ مجھے سونے دیا۔ حالانکہ جب کبھی مجھے رات کو پتے کا شدید درد بھی ہوتا ہے محض اس لئے ہائے وائے نہیں کرتی کہ ان کی نیند خراب نہ ہو۔''

''آپ بھائی جان کا غصہ مجھ پر اتار رہی ہیں! کیسے ہیں وہ''

''اب مزے سے سو رہے ہیں مجھے سر درد میں مبتلا کر کے۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دے۔ لیکن اس خیال سے کہ بات بڑھ نہ جائے وہ نرم لہجے میں کہتا ہے۔

''میں جلد واپس آ جاؤں گا۔''

''اچھا چلو نہا دھو کر ناشتہ کر لو۔''

''میں ناشتہ بھی وہیں کروں گا۔ مجھے جلدی ہے۔''

''اچھا جیسے تمہاری مرضی ۔۔۔۔۔۔ مگر موٹر سائیکل نہ لے جانا۔ تمہارے بھائی جان کو ضرورت ہوگی۔''

''جی اچھا۔''

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا ہے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا اور باہر جانے لگتا ہے اس کی والدہ کہتی ہیں:

''جلو آ جانا بیٹے بہت سے کام ہیں۔''

''کام کام کام'' وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل جاتا ہے گلی میں ابھی سے بہت شور اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ہے۔ شامیانے لگ رہے ہیں۔ قناتیں تانی جا رہی ہیں۔ پیاز چھیلے جا رہے ہیں اور اینٹیں جوڑ کر بڑے بڑے چولہے بنائے جا رہے ہیں۔ اسے ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی کوئی اسے آواز دے کر بلا لے گا۔ وہ جلد از جلد ان آشنا لوگوں اور آوازوں سے دور چلا جانا چاہتا ہے۔

تھوڑی دور جا کر گلی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے وہ پہلے دائیں جانب قدم بڑھاتا ہے پھر کچھ سوچ کر بائیں جانب کر مڑ جاتا ہے۔ ابھی دکانیں نہیں کھلیں ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے صرف دودھ دہی بیکری قصاب اور حجاموں کی دکانیں کھلی ہیں دینو حلوائی کی دکان پر نہاری اور حلوہ پوری خریدنے والوں کا ہجوم ہے۔ اس کا جی نہاری کھانے کو چاہتا ہے مگر وہ جلد از جلد اپنی آزادی میں مخل ہونے والے جان پہچان کے لوگوں سے دور نکل جانا چاہتا ہے۔

سڑک پر پہنچ کر اپنی طرف لاے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو جاتا ہے مگر پھر یہ دیکھ کر کہ دوسری جانب والی بس پہلے آ گئی ہے۔ وہ سڑک پار کر کے جلدی سے بس پر سوار ہو جاتا ہے۔ بس کنڈیکٹر ٹکٹ کے لئے کہتا ہے تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس جگہ کا ٹکٹ خریدے لیکن ساتھ والا مسافر ریلوے سٹیشن تک کا ٹکٹ مانگ کر اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے فٹ پاتھ پر چلتے ایک میلا کچیلا لڑکا جس کے جسم پر صرف ایک قمیص ہے۔ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

''کیوں مانگتے ہو؟''

''بھوکا ہوں''س

''کیوں بھوکے ہو؟''

''میرے باپ نہیں ہیں''

''اچھا ہے نہیں ہیں'' وہ کہتا ہے ''اگر ہوتے تو تم اپنی مرضی سے بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔''

وہ لڑکے کو کچھ پیسے دیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بہت رونق ہے۔ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ انکوائری سے معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ قلیوں کر پیسے دے رہے ہیں۔ عزیز و اقارت سے گلے مل رہے ہیں۔ وہ مختلف گاڑیوں کے اوقات اور کرائے نامے پڑھنے لگتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کسی اپ ٹرین میں بیٹھ کر چچا کے ہاں چلا جائے۔ لیکن پھر اس خوف سے کہ اس کے پاس اپنی چچا زاد کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں وہ ارادہ بدل لیتا ہے پھر اسے خیال آتا ہے کہ کسی ڈاؤن پر ین کے ذریعے ماموں کے ہاں چلا جائے۔ مگر پھر اسے مامی کی تیوری کے بل یاد آ جاتے ہیں اور وہ کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر آ جاتا ہے۔ اور ایک چکر لگاتا ہے پھر چائے کے اسٹال پر کھڑے ہر کر ناشتہ کرتا ہے۔ ناشتے سارغ ہو کر ایک بنچ پر آ بیٹھتا ہے۔ اور گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آ جاتی ہے۔ وہ ہجوم سے ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور چڑھنے اور اترنے والوں کو خالی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے پھر جب گاڑی چلی جاتی اور پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ اسی بنچ پر آ بیٹھتا اور دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں وچ کا ایک چیونٹا سا کلبلاتا ہے کہ جب اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے کہاں جانا ہے تو وہ ایک گاڑی کے چلے جانے کے بعد دوسری اور پھر تیسری گاڑی کا انتظار کیوں کر رہا ہے۔ وہ اٹھ کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آ جاتا ہے۔ چوک پر پہنچ کر کچھ دیر سوچتا ہے۔

پھر بڑے بازار کی طرف چل دیتا ہے۔

تھوڑی دور جا کر اسے اپنا ایک دوست مل جاتا ہے علیک سلیک کے بعد وہ اس سے ضروری کام کا بہانہ کر کے رخصت ہوتا ہے اور کھلی اور بند دکانوں کے آگے سے گزرتا بڑے چوک پر آ جاتا ہے۔ یہاں پرانی کتابوں کے اسٹال ہیں وہ ایک اسٹال پر رک کر کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے۔ پھر دورویہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلنے لگتا ہے۔

چڑیا گھر کا بورڈ دیکھ کر رک جاتا ہے پھر ٹکٹ خرید کر چڑیا گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ چڑیا گھر میں جانوروں اور پرندوں کو کٹہروں اور پنجروں میں بند دیکھ کر اس کا دم سا گھٹنے لگتا ہے وہ جلد از جلد اس ماحول سے نکل جانا چاہتا ہے کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شیر کی آواز سن کر چاروں طرف سے تماشائی اس کے کٹہرے کے سامنے جمع ہونے لگتے ہیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ شیر فرش پر بیٹھا تماشائیوں کے ہجوم اور قید کی ایک جیسی زندگی سے اکتا کر زور زور سے دھاڑ رہا ہے وہ تماشائیوں سے جس قدر بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ تماشائی جمع ہوتے جاتے ہیں پھر ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ شیرنی اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور اس کے قریب آ کر اپنا سر اس کے سر سے رگڑتی ہے جیسے دلاسہ دے رہی ہو اور شیر کی آواز رفتہ رفتہ تھم جاتی ہے۔ اسے بھابی کی بات یاد آتی ہے کہ تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اس کا جی چاہتا ہے تم پنجروں کے پٹ کھول کر چڑیا گھر کے سبھی جانوروں اور پرندوں کی آزاد کر دے مگر پھر اسے کمزور جانوروں کا خیال آتا ہے جو کٹہروں سے نکلتے ہی طاقتور درندوں پرندوں کا لقمہ بن جائیں گے۔ وہ آگے بڑھتا اور ہرنیوں کی ریلنگوں اور خاردار تاروں سے گھرے جنگلے میں بے فکری سے ٹہلتے دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ جنگل کی نسبت یہاں کس قدر محفوظ ہیں۔ کسی چیتے کی گھات کا ڈر نہ کسی شکاری کی بندوق کا خوف' تو کیا کمزوریوں کی بقا صرف قید اور غلامی میں ہے۔ وہ آزادی کا ایک دن بھی چین اور اطمینان سے نہیں گزار سکتے؟ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا اور جھنجھلا کر باہر نکل آتا ہے۔

دوپہر ڈھلنے لگی ہے۔ اور اسے بھوک ستا رہی ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ پھر سگریٹ کے کش لگاتا ہوا باہر آتا اور سڑک کے کنارے ایک اونچی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتا اور گزرنے والی گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں پڑھنے لگتا ہے۔

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ وہ حساب لگا کر دیکھے ایک گھنٹے میں مختلف اقسام اور ماڈلوں کی کتنی گاڑیاں وہاں سے گزرتی ہیں۔ اس سے چوبیس گھنٹوں میں وہاں سے گزرنے ولای گاڑیوں کا اوسط نکالنے میں آسانی رہے گی۔ پھر وہ ایک ماہ اور پھر ایک سال کا

اوسط نکلتا ہے۔لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ان اعدادوشمار کا کیا کرے؟

دیوار پر چڑھ کر بیٹھے بیٹھے اور گاڑیوں کی تعداد گنتے گنتے سہ پہر ہو جاتی ہے' درختوں کے سائے لمبے ہو جاتے اور گرمی کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ ایک طرف کو سایہ دار درختوں کے نیچے چلتا رہتا ہے اور شہر کی سب سے بڑی سیر گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ سیر گاہ میں خوش لباس لوگ اور خوبصورت بچے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مصنوعی آبشاروں سے گرتا پانی اور چاروں طرف کھلے ہوئے رنگ برنگ خوشنما پھول دیکھ کر اس کے اندر کی گھٹن کم ہونے لگتی ہے۔ اسی لمحے ایک خوبصورت عورت اس کے قریب سے گزرتی ہے اور اسے میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ یقیناً وہ بھی اس طرح کی طرح تنہا اور ویران ہوگی اور اس نے بھی انہی دنوں اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کیا ہوگا۔ مگر پھر اسے مصنوعی جھیل کی طرف پرواز کرتے پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

''جھوٹ' جھوٹ جھوٹ''

''ریا۔ریا۔ریا''

''دروغ۔دروغ۔دروغ''

اس کے اندر درد کی ٹیسیں جاگتی ہیں۔ وہ پھولوں اور بچوں کی طرف توجہ دینا چاہتا ہے۔ مگر درد کی ٹیسیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ تھکے ہوئے پاؤں اٹھاتا مین گیٹ کی طرف چل دیتا ہے۔

اس کی جیب میں کرائی موجود ہے لیکن وہ پیدل چلتا ہے۔ سڑکوں بازاروں اور گلیوں میں گھومتا مکانوں پر لگی نیم پلیٹوں اور دکانوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلت رہتا ہے۔ پھر اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دروغ بھرے دن کے غروب ہونے پر اپنے گھر کی گلی میں داخل ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکتا ہے پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگتا ہے گلی میں آوارہ کتے جگہ جگہ ہڈیاں چچوڑ رہے ہیں۔ شامیانے اور قناتیں ہٹائی جا چکی ہیں اور اس کے گھر کے سامنے والے چھجے پر کوئی پرندہ موجود نہیں ہے۔ وہ تھکا ہارا نڈھال سا گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

''کہاں تھے تم؟'' والدہ پوچھتی ہیں۔

سارا دن کہاں غائب رہے؟'' بہن کہتی ہے۔

''ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا تھا؟'' بھائی گرجتا رہا۔

باؤجی غصے میں کمرے سے باہر آتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''صبح کے گئے ہوئے تم پورا دن ضائع کر کے اب آ رہے ہو تمہیں شرم آنی چاہئے''

''شرم کس بات کی باؤجی۔'' وہ غصے سے کہتا ہے۔''کیا مجھے اپنی زندگی کا ایک دن بھی اپنی مرضی سے گزارنے یا ضائع کرنے کا اختیار نہیں؟''

بھابی قریب آتی ہیں اور چڑیا گھر کی شیرنی کی طرح اس کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑ کر کہتی ہیں۔''تم تو مرد ہو دل بڑا کرو بھیا ۔۔۔۔۔۔آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اب کیا رہ گیا ہے جو ٹھیک ہو جائے گا''

وہ ضبط کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کئی دنوں کا روکا ہوا رونا ضبط کے سارے بندھن توڑ دیتا ہے۔گھر کے سب لوگ سہم جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان پوچھے سوالوں کا جواب تلاش کرنے لگتے ہیں۔



وقت سمندر

قلعہ نما عالی شان عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی میرے قدم رک جاتے ہیں۔ میں اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں مگر پھر آنکھیں کھولتا ہوں تو کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سا وقت اور مقام ہے۔ دن ہے نہ رات۔۔۔۔۔۔ اندھیرا ہے نہ اجالا۔۔۔۔۔۔ طلوع ہے نہ غروب۔۔۔۔۔۔ موت ہے نہ حیات۔ شاید اس کے بین بین کوئی کیفیت یا سمے ہے یا اس سے ماورا۔۔۔۔۔۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا کہ کون سا زمانہ ہے یوں لگتا ہے جیسے آگے پیچھے دائیں بائیں پانی ہی پانی ہے بے رنگ بے بو اور بے ذائقہ پانی۔۔۔۔۔۔ جو گرم ہے نہ سرد اور جس کے حرکت کرنے یار کے ہوئے ہونے کا بھی پتہ نہیں چل رہا مگر یقیناً وہ حرکت کر رہا ہوگا اور میں اس میں بہہ رہا ہوں گا۔ پانی کی سلطنت میں ڈوبنے یا بہنے کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ مگر میں نے تو کسی بھی مقام سے اس میں اپنی بے پتوار کشتی نہیں ڈالی۔ پھر میں اس میں کب اور کیسے شامل ہو گیا اور اب پتہ نہیں کب تک بہتا چلا جاؤں۔ مسلسل بہتے چلے جانے کی ایک جیسی کیفیت کا تصور کر کے میں گھبرا جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں۔

"کنارا کب آئے گا؟"

"یہاں کنارا نہیں ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے بہت وسیع سمندر ہے اور کنارے پر پہنچنے کے لئے ابھی بہت دیر لگے گی۔"

"یہاں تمہارے ساتھ الفاظ بہت' وسیع' سمندر' کنارا' پہنچنا' ابھی' بہت' اور دیر بے معنی ہیں۔"

"تو کیا ہمیں کہیں نہیں پہنچنا ہے؟"

"اور اگر میں واپس جانا چاہوں؟"

"یہاں آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں اوپر اور نیچے کا کوئی فرق نہیں۔ یہاں سمتیں ہیں اور نہ نشیب و فراز۔"

"پھر کیا ہے؟"

"ایک تسلسل' ایک دوام' ایک بے پایانی اور ایک لامحدودیت۔"

تو کیا ہم زمان و مکان سے ماورا کسی مقام پر ہیں؟"

مقامیت کا تصور یہاں عبث ہے۔"

"تو کیا میں ابدیت کے سمندر میں فنا ہو چکا ہوں؟"

"نہیں تم فنا نہیں ہوئے سمندر میں مل کر سمندر ہو گئے ہو۔"

"میں سمندر میں مل کر سمندر نہیں ہونا چاہتا۔ میں اپنی پہچان نہیں کھونا چاہتا۔"

پہچان یہاں ایک بے معنی اصطلاح ہے اوس' بوند' جھاگ' لہر' موج' حباب اور قطرے کا الگ کوئی وجود نہیں ہوتا سب سمندری کی ہی مختلف صورتیں ہیں تم موج بھی ہو اور دریا بھی۔ قطرہ بھی ہو اور سمندر بھی۔"

سمندر میں مل کر سمندر ہو جانے کے خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہوں مگر حد نظر تک پھیلے پانی میں باہر کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

مجھے اپنا سمندر یاد آتا ہے۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم اس کے اتھلے پانیوں میں بے سدھ پڑے دھوپ چوستے اور ہوا پھانکتے رہتے تھے کہ لاکھوں برس بعد ایک روز سانس لینے کی امنگ پیدا ہوئی اور ہم عدم سے وجود میں آئے تھے۔ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم سمندر کی کوکھ سے نکل کر رینگتے ہوئے خشکی کی طرف چلے جاتے تھے لیکن سورج کی تماشت اور بے پانی کی ہوا سے ہمارا دم گھٹنے لگتا اور ہم واپس اس کی آغوش میں پناہ لیتے تھے۔ پھر ایک روز ہم باہر آئے تو ہمیں واپس کا راستہ نہ ملا۔ شاید سمندر ہمیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ یا شوق مہم جوئی میں جو ہماری گھٹی میں پڑا تھا۔ ہم اس سے دور نکل آئے تھے۔ پھر ہم دلدلوں اور جھاڑیوں میں رہنے لگے تھے۔ ہم جھیلوں' تالابوں اور دریاؤں سے دور نہ جاتے تھے۔ اور آسمان بارش کی صورت میں سمندر انڈیلتا تو ہم خوشی سے ناچ اٹھتے تھے پھر نجانے ہم نے کیا کیا صورتیں بدلیں اور کیسی کیسی صعوبتیں اٹھائیں اور کہاں کہاں بھٹکتے پھرے۔ ہم اس سے چور چلے جاتے تھے لیکن اس نے ہمیں کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ ہر جگہ اپنی پانی سے لدی ہوائیں ہمارے لئے بھیجتا رہا۔ میدانوں' پہاڑوں' وادیوں' اور صحراؤں میں ہم جہاں بھی گئے اس نے اپنے قیمتی تحفوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ہماری سرپرستی کرتا رہا۔ ہمارے لئے زمین سے اناج اور سبزہ اگاتا اور درختوں کی پور پور میں نمی پہنچاتا رہا۔

میں جب بھی اداس ہوتا اپنے اندر سے نکل کر اس کے کنارے جا بیٹھتا تھا اور ساحل کی طرف آتی موجوں اور نظروں سے اوجھل ہوتی کشتیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ پانی مجھے ہمیشہ مسحور کرتا رہا ہے اسے دیکھتے رہنے سے میری اداسی دھلنے لگتی تھی۔ اس کی عظمت اور

وسعت کا تصور مجھے تقویت دیتا۔۔۔۔۔۔وہ عظیم اور مہربان تھا۔سینکڑوں دریا دن رات اس کے اندر منہ ڈالے اپنی طغنیاں اگلتے رہتے تھے مگر وہ چھلکتا نہیں تھا۔ہر خطے ہر رنگ اور ہر نسل کے پانی اس میں مل کر ایک ہو جاتے تھے وہ تین چوتھائی زمین پر پھیلا ہوا تھا۔اس کا آبی خون بادلوں' دریاؤں اور ندی نالوں کے ذریعے زمین کے سارے بدن میں گردش کرتا تھا۔وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔اور اپنے قوانین کی سختی سے پابندی کر کے ہمارے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کرتا تھا۔ہم جہاں جاتے اس کی سطح سے بلندی کا حساب رکھتے اس کی قربت میں ڈھارس بندھتی اور نیا ولولہ پیدا ہوتا اور اس کے لمس سے ماتا کا احساس ہوتا تھا مگر یہ کیسا سمندر ہے؟

جس کا کوئی اور چھور نہیں۔

جس کا کوئی کنارا ہے نہ ساحل۔

جس کی کوئی سطح ہے نہ تہ۔

بس ایک ہولناک خاموشی سے بہتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔اس کی بے پایانی دیکھ کر فنا کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔پتہ نہیں اس میں بہتے چلے جانے کی کیفیت کبھی ختم بھی ہوتی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔۔میں ہیبت کے پانیوں میں ڈوبے ڈوبے پوچھتا ہوں۔

''ہم کب تک۔۔۔۔۔۔کتنے سال' کتنی صدیوں یونہی بہتے رہیں گے؟''

''صدیاں سال' دن اور لمحے یہ سب الفاظ اضافی ہیں۔۔۔۔۔۔ہونا نہ ہونا یہاں ایک ہے۔''

''پھر اس کے بعد؟''

''یہاں پھر نہیں ہوتا اور نہ پہلے اور بعد میں کوئی فرق ہے۔''

''ار میرا ماضی' میری تاریخ۔۔۔۔۔۔میری تہذیب؟''

''یہاں ماضی ہے نہ حال اور نہ مستقبل۔۔۔۔۔۔تاریخ تہذیب کا تصور اس گرداب میں لایعنی ہے۔''

اور حسن اور خوشی اور جذبے اور زندگی؟''

''سب باطل۔''

اور حرکت' محنت' عمل' ترقی؟''

''لاحاصل۔''

"یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ یہ ایک سنگین مذاق ہے۔"

"یہی مقدر ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔۔۔۔۔۔۔میں اپنے پانیوں کو الگ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے پانی؟"

"ہاں میرے پانی۔۔۔۔۔۔۔میں انہیں پہچان سکتا ہوں۔"

اور مجھے یاد آتا ہے۔

وہ ساحل کی ریت پر قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ سمندر اسے ہمک ہمک کر اور میں سہم سہم کر دمندر کو دیکھتا تھا۔ میں سمندر دیکھنے آیا تھا مگر وہ مجھے دیکھنے نہیں دیتی تھی۔ بار بار سامنے آجاتی اور اسے اپنی اوٹ میں چھپا دیتی تھی۔ وہ میرے ساتھ آئی تھی مگر سمندر کیکنارے پہنچتے ہی اتنی تبدیل ہو گئی تھی کہ لگتا تھا ابھی چھلک جائے گی۔ آؤ پانی میں اتریں۔" اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پانی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا تھا مجھے شرارت سوجھ رہی تھی۔

"تم پانی میں نہ اترنا پلیز۔"

"کیوں کیا ہے مجھے؟"

"تمہیں تو کچھ نہیں اور نہ ہوگا سمندر میں طغیانی آجائے گی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اس کی جگمگاتی ہنسی کی آواز سمندر کے پانی پر دور تک دکھائی دیتی رہی تھی۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ایک لہر آئی تھی اور ہمیں گدگدا کر واپس چلی گئی تھی۔ یقیناً وہ لہر کسی نہ کسی صورت میں کہیں نہ کہیں اب بھی موجود ہوگی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

ہم سکوٹر پر سوار پہاڑ پر جا رہے تھے کہ ہمیں بارش نے آلیا تھا اور ہمیں بھگو کر نیچے ندی میں اتر گئی تھی۔ بارش میں بھیگ اور دھل کر وہ نکھر آئی تھی اور قوس قزح بن گئی تھی۔ قوس قزح سے آلودہ پانی بھی یقیناً یہیں کہیں ہو گا اور وہ پانی بھی جو ہماری موجودگی میں دیواروں والے گھرے آبشار سے گرتا رہا تھا اور دریا کا وہ پانی بھی جس پر میں اسے کئی برس تک فراقیہ چٹھیاں لکھتا رہا تھا۔

"مجھے میرے پانیوں کا حساب چاہئے۔"

"تم پھر بھول گئے یہ سمندر نہیں ہے۔"

"پھر یہ کون سا سمندر ہے؟"

اس کا کوئی نام نہیں لیکن اگر تم آسانی کے سمندر کہنا چاہتے ہو تو سمندروں کا سمندر کہو۔ بحرِ بے کنار سمجھو۔"

"اور وہ سمندر؟"

"اس بحرِ عظیم میں وہ ایک قطرہ ہے۔"

"اور وہ قطرہ جو مجھے رخصت کرتے وقت ایک بار اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا؟"

وہ ہنستا ہے اور ہنستا ہی چلا جاتا ہے مجھے اس کی ہنسی یاد آجاتی ہے۔

"دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن اناروچوں۔"

مجھے یاد آتا ہے۔ اس نے کہا تھا جوگی تم جھوٹ کہتے ہو۔ گئے وقت کو کون واپس لاسکتا' اور بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتا ہے۔ اور وہ اس وقت تک نہیں جانتی تھی کہ وہ جوگی میں خود ہوں اور وقت کی طرح سنگدل نہیں ہوں۔

پھر مجھے یاد آتا ہے۔ جب میں عزت بیگ تھا اور چناب کے کنارے بیلے میں بھینسیں چراتا تھا۔ مجھے تیرنا اور غوطہ لگانا آتا تھا اور زمیں تند لہروں کے منہ سے اس کے لئے مچھلی چھین لاتا تھا مگر۔۔۔۔۔۔۔ اس رات۔۔۔۔۔۔۔ اس نے منع کر دیا تھا اور حالانکہ وہ تیرنا نہیں جانتی تھی وہ طوفانی پانی میں اتر گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اور کہتے ہیں تھے بہتا ہوا پانی اوپر اچھالتا اور رکا ہوا پنی نیچے دباتا ہے۔ لیکن اسے بہتا ہوا پانی بہالے گیا تھا اور وقت نے مجھے ٹھہریہوئے پانی کا جوہڑ بنا دیا۔ جہاں سے بوند بوند بھاپ کی صورت نکل بھاگنے میں میرا پورا جنم صرف ہو گیا تھا۔

مجھے یاد آتا ہے ہزاروں لاکھوں برس پہلے ہم ایک ساتھ چلے تھے مگر ہر زمانے میں ہمیں ایک دوسرے کے قریب رہنے کے لئے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ روحانی اور جسمانی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ زہر پھانکنے اور دریا میں کود جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ سانپوں سے ڈسوایا اور درندوں کے آگے پھینک دیا جاتا تھا۔ قبر میں زندہ گاڑ۔۔۔۔۔۔۔ اور دیواروں میں چن دیا جاتا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی بلند دیوار اٹھا دی گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے سے قاصر تھے اور ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے لئے اپنی قیمتی ار مختصر زندگی کے بہت سے سال ضائع کرنا پڑے تھے۔

مجھے یاد ہے ہمارے گھر کے پچھواڑ میں جامن کا ایک پیڑ تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس پر آسیب رہتا ہے جو خوبصورت اور نوخیز لوگوں کو چمٹ جاتا ہے۔ ہر سال پیڑ جامنوں سے لد جاتا مگر کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ جامنوں کے بوجھ سے نرم لچکیلی شاخیں جھکنے لگتیں۔ ٹہنیوں سے لگی لگی جامنیں سوکھنے اور سڑنے لگتیں مگر کوئی اتارنے نہ آتا اور پوری بستی میں میں پہلا شخص تھا جس نے فیصلہ کیا تھا کہ جامن کو آسیب کے قبضہ سے واگزار کرایا جائے مگر جب میں نے اس کا پھل چکھا تو جامن کا ایک پیڑ میرے اندر اگنے لگا اور برسات سے پہلے ہی ساری ٹہنیاں ہری اور لال جامنوں سے لد گئیں۔

مجھے یاد آتا ہے۔

ہر سال دریا بند توڑ کر گھروں، آنگنوں، کھیتوں اور گلیوں میں آجاتا اور جاتے ہوئے بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے جاتا تھا۔ سامان، اناج، مویشی اور آدمی۔ اور جب پانی اتر تا تھا تو بعض کھوئی ہوئی چیزیں اچھی یا بری حالت میں مل بھی جاتی تھیں مگر ایک بار دریا بستی کی سب سے زیمتی چیز بہا کر لے گیا اور قیمتی چیزیں کون واپس کرتا ہے۔ پانی اترا تو اس کی ہر جگہ تلاش ہوئی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی امدادی کشتی میں سوار ہو کر چلی گئی تھی مگر مجھے معلوم تھا وہ اپنے قدیم آبائی گھر چلی گئی تھی اور کسی دوسرے زمانے میں میرا انتظار کرتی تھی۔

اور موسم آتے جاتے رہے۔

جامنیں پکتی اور سڑتی رہیں۔

اور دبلی گائیں ساری فربہ گایوں کو اور سوکھے خوشے ہرے ہرے خوشوں کو کھا گئے۔

اور پھر کئی برسوں یا شاید صدیوں کے بعد جیسے کسی نے مجھے خنجر بھونک دیا۔ ''وہ زندہ ہے۔''

اور میرے اندر کوئی گردان کرنے لگا۔ ''وہ زندہ ہے میں زندہ ہوں تو زندہ ہے ہم زندہ ہیں۔''

اور میں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ کھو جانے سے پہلے اس کے حسن کا دور دور تک شہرہ تھا اور اسے قدرت کا حسین شاہکار خیال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بستی میں اس کی موجودگی میں چراغ جلانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور اسے ہر صبح پھولوں سے تولا بھی نہیں جاتا تھا۔ مگر بستی میں ساری رونق، روشنی اور چہل پہل اسی کے دم سے تھی۔ مجھے یاد آتا ہے میں اسے دیکھ کر لرز گیا تھا۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ سچ مچ وہی ہے۔

اسے دیکھ کر وقت کی سفاکی اور انسان کی بے مائیگی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ میں اسے اس حال میں دیکھوں گا۔ اس کا میں نے

کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ مجھے وہ لہلہاتے دن یاد آئے تھے جب وہ محض دیکھنے سے گلابی عنابی ہو جاتی اور چھو لینے سے اس کے جسم میں برقی رو دوڑتی جاتی تھی۔ مگر اب لگتا تھا جیسے کسی نے پیچھے سے زمین سوئچ بند کر دیا ہو۔

اور اس نابینا بڑھیا کی پکار سن کر یوسف گھوڑے سے اتر آیا اور اسے پہچان کر رو پڑا۔

یوسف پچھے دس زلیخا حسن کتھے اج تیرا

کہے زلیخا ہجر رڑھا یا ہتھ نہ پہنا میرا

یوسف پچھے دس زلیخا کتھے لب دی لالی

کہے زلیخا جال سدھائی لاٹ فراقاں والی

یوسف پچھے دس زلیخا زلفاں کدھر گیاں

کہے زلیخا۔۔۔۔۔۔۔

یوسف پچھے۔۔۔۔۔۔۔

وہ ایک قلعہ نما عالی شان عمارت تھی اور وہیل چیئر میں پتھرائی پڑی تھی وہ بول سکتی تھی نہ سن سکتی تھی اور نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتی تھی۔

اس کی ایک آنکھ خشک تھی اور دوسری میں ایک آنسو بس امنڈ نے ہی والا تھا۔ اور تب سے ۔۔۔۔۔۔۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ کون سا وقت اور مقام ہے۔ دن ہے نہ رات۔ اندھیرا ہے نہ اجالا۔ طلوع ہے نہ غروب۔ یوں لگتا ہے جیسے آگے پیچھے دائیں بائیں پانی ہی پانی ہے۔ بے رنگ' بے بو اور بے ذائقہ پانی جو گرم ہے نہ سرد اور جس کے حرکت کرنے یا رکے ہوئے ہونے کا بھی پتہ نہیں چل رہا۔



رابطہ

ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اسے میری موجودگی کا احساس ہے یا نہیں۔ البتہ میں اسے گھر کے مختلف گوشوں میں چلتے پھرتے اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔

یوں تو پتہ نہیں وہ کب سے یہاں ہے لیکن میرے اس سے یک طرفہ تعارف کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چند ماہ پہلے ایک روز میں نے اسے باورچی خانے کے فرش پر اپنے سے کئی گنا بڑا خوراک کا ایک دانہ کھینچتے ہوئے دیکھا اور اس کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر چونکا تھا۔ پھر اس کے کچھ ساتھی آ گئے اور وہ خوراک کا یہ دانہ ان کے سپرد کر کے ایک طرف کو یوں چل دیا جیسے اسے اس سے اہم تر کسی کام یا مہم پر جانا ہو۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ جب اس کا ٹھکانا باورچی خانے ہی کے کہیں قریب واقع تھا اور وہاں خوراک کی وافر مقدار موجود تھی تو وہ کسی اور سمت کو کیوں نکل گیا؟ میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کا عرض عبور کر کے صحن کی طرف روانہ ہو گیا مگر پھر لمبی لمبی گھاس میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دو ایک روز بعد میں نے اسے صحن کے ایک کونے میں درخت سے اترتے دیکھا۔ یقیناً وہ ایک ایک ڈال پات کا چکر لگا آیا تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ آخر اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی لمبے سفر پر نکلا ہوا ایسا مہم جو ہو جو گہرے رازوں سے پردہ اٹھانا اور نئی نئی دنیائیں دریافت کرنا چاہتا ہو۔ میری اس میں دلچسپی بڑھتی رہی اور میں بھی اس کے ہمراہ اپنے ہی گھر میں رہتے ہوئے دور دراز کے سفروں پر نکل جاتا۔ دشوار گزار پہاڑیوں تاریک اور گہرے غاروں، گھنے جنگلوں، اور ٹھاٹھیں مارتے دریاؤں اور بے کراں پھیلے سمندروں کی سیاحت کرتا۔ میں نے کئی بار محض ایک پتے یا تنکے پر سوار ہو کر سمندر عبور کیا۔ کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گرد و غبار کا شدید طوفان اٹھتا جس کی لپیٹ میں آ کر کسی پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتا اور فضا کی لامحدود پہنائیوں سے گزرتا ہوا واپس زمین پر آ رہتا۔ اس کی جون میں رہتے ہوئے اپنے اصلی وجود کا ادراک جہاں ایک مشکل امر تھا وہاں نہایت دلچسپ اور ولولہ انگیز تجربہ بھی تھا۔ میں اپنے گزشتہ وجود کو یاد کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ میرے چھوٹے سے ذہن کی گرفت میں نہ آتا۔ میں کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دور دور تک دیکھنا چاہتا لیکن مجھے چند انچوں سے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں واپس

اپنے قالب میں آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔

ایک دن، کئی دنوں بعد گہرے بادل گھر آئے۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ بوندا باندی شروع ہوئی۔ میں ص ن میں رکھی چیزوں کو سنبھال رہا تھا کہ مجھے اس کا خیال آیا۔ کہیں ایسے موسم میں وہ باہر نہ گھوم رہا ہو۔ میں نے دوربین نکالی اور اسے تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر بعد وہ مجھے چھت کی منڈیر پر چلتا دکھائی دیا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے تک بارش تیز ہوگئی اور غالباً اس نے کسی قریبی سوراخ میں پناہ لے لی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ جل تھل ایک ہوگیا۔ مجھے برابر اس کا خیال ستا تا رہا کیا پتہ سوراخ میں پانی گھس آیا ہو۔ کیا پتہ وہ بھوکا پیاسا ہو۔ اسے سردی لگ رہی ہو یا خوف کے مارے کانپ رہا ہو۔

اگلی صبح دھوپ نکلی تو میں اس کی تلاش میں نکلا۔ ہر جگہ دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ بند پرنالے کے قریب جمع پانی پر نظر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر پرنالے کے منہ سے تنکے ہٹائے تو رکا ہوا پانی تیزی سے چلنے لگا۔ اچانک میری اس پر نظر پڑی وہ پانی میں بہتا ہوا تیزی سے پرنالے کی طرف جارہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے بچا لیا۔

میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ اسے بتاؤں کہ وہ کس قدر خطرے میں گھر گیا تھا اور میں نے اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے لیکن افسوس میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہم باہم کلام کر سکتے تھے نہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جان سکتے تھے اور حالانکہ میری اس کے بارے میں معلومات نسبتاً زیادہ ہیں لیکن پھر بھی اکثر میں کسی ویسے ہی دوسرے کو اس کی جگہ سمجھ لیتا ہوں اور اس وقت بھی جب وہ میرے سامنے ہوتا ہے میں وثوق سے نہیں بتا سکتا کہ وہ وہی ہے۔ یقیناً وہ بھی جب میری قمیص کے کالر پر چڑھتا یا میری گردن پر کاٹتا ہے نہیں جانتا ہوتا کہ یہ میں ہوں۔ اس کا محسن ۔۔۔۔۔۔۔ جس نے متعدد بار اسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہے اور جس کی وجہ سے وہ زندہ اور محفوظ ہے اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اگر میں یہ گھر جس میں وہ رہتا ہے نہ بناتا تو شاید وہ پیدا ہی نہ ہوتا یا اگر کہیں کسی دوسری جگہ پیدا ہو بھی جاتا تو عین مین وہی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا اور اگر چہ اسے پتہ نہیں ہے کہ اسے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد خوراک کیسے مل جاتی ہے اور یہ کہاں سے آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی میری انہی عنایات کی مرہون منت ہے۔ یہی نہیں میں چاہوں تو پھونک مار کر اسے ہلاک کر سکتا ہوں۔ چٹکی بجانے میں اسے مسل سکتا ہوں اور ذرا سی بے احتیاطی سے چلوں تو اسے اس طرح کچل سکتا ہوں کہ اس کا وجود کا سراغ تک نہ ملے۔ کاش اسے یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں۔ لیکن افسوس میں اسے کچل تو سکتا ہوں۔ پھونک مار کر ہلاک تو کر سکتا ہوں لیکن اپنی نوازشات کے صلے میں اس کے منہ سے شکریے کے

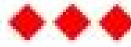
الفاظ نہیں سن سکتا تاہم اس سے رابطہ کی خواہش کے پس پردہ محض شکریہ کے بول سننے کی خواہش نہیں کوئی اور جذبہ بھی ہے جس کا پوری طرح سے مجھے خود بھی علم نہیں ہے۔ بس ایک انجانا سا دکھ ہے کہ میں اور وہ ایک ہی جگہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے محض ذہن اور جسامت کے فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہو سکتے۔ اپنی اپنی دنیا کی کہانی نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کئی بار سوچا ہے کہ اسے نظر انداز کر دوں' بھول جاؤں' اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دوں۔ لیکن پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مجھے اچانک' نظر آ جاتا ہے تکیے کے غلاف پر رضائی یا کمبل پر رینگتا ہوا' ردی کی ٹوکری' کے کنارے' کسی دیوار یا چھت پر چلتا ہوا اور میں نئے سرے سے اس کا تعاقب شروع کر دیتا ہوں یہ جاننے کے لئے کہ آخر اس کی زندگی اور تگ ودو کا راز کیا ہے اور وہ باورچی خانے یا سٹور روم کو چھوڑ کر جگہ جگہ کیا تلاش کرتا پھرتا ہے۔

کبھی کبھی میں اس کے بارے میں دلچسپ باتیں سوچتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ ممکن ہے وہ اپنے ساتھیوں اور ہم جنسوں میں سب سے زیادہ ذہین ہو۔ اس نے ایک روز ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے دعویٰ کیا ہو کہ ان کے آس پاس ایک نہایت عظیم وجود یعنی میں موجود ہوں۔ اس کی باتیں سن کر ان سب نے اس کی ہنسی اڑائی ہو اور اسے خبطی اور گمراہ قرار دیا ہو۔ عین ممکن ہے ان سب نے مل کر اسے مجبور کیا ہو کہ وہ اپنے اس دعویٰ سے دستبردار ہو جائے ورنہ اسے زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔ سولی پر چڑھنا ہوگا اور اب وہ اس دنیا کی پیائش اور میری تلاش میں نکلا ہو۔ میں اسے گھر کے مختلف کمروں کونوں کھدروں اور دشوار گزار جگہوں پر گھومتے دیکھتا ہوں تو میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ اسے واقعی کسی خاص شے کی تلاش ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس کی مدد کروں اسے بتاؤں کہ وہ جسے گھر کی فضاؤں' کمروں' دیواروں' چھتوں' باورچی خانے کے ڈبوں' سٹور روم کے صندوقوں' ڈرائنگ روم کے صوفوں' باغیچے کے پودوں اور گھر کی چار دیواری کی ایک ایک اینٹ میں تلاش کرتا پھر رہا ہے وہ میں ہوں اور اس کے سامنے موجود ہوں لیکن افسوس وہ میرے سامنے ہوتے ہوئے بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ میری آواز نہیں سن سکتا۔ وہ تو یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر ہوگا کہ وہ میرے مقابلے میں کس قدر حقیر اور کمزور ہے اور اگر اسے ایسی کروڑوں زندگیاں دی جائیں اور وہ کبھی بھی ہمت نہ ہارے تب بھی وہ مجھے دریافت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا بھی رہ رہ کر احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی بات اس تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس سے خواہش کے باوجود رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ اس کے ذہن میں کوئی الہامی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسے آہٹوں کی وجہ سے میری موجودگی کا شبہ یا احساس ہے اور وہ سچ مچ مجھے تلاش کر رہا ہے تو اس تلاش کا نتیجہ کس قدر دلچسپ ہوگا اور وہ اس گھر کو جس کا اس نے کئی ہفتوں مہینوں میں چکر لگایا ہے۔ پوری

کائنات سمجھتا ہوگا اور جب وہ ایک روز اپنے ان گنت ہم جنسوں کو جمع کر کے اعلان کرے گا کہ اگرچہ وہ اس عظیم وجود کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو ان کے آس پاس میں کہیں موجود ہے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ وہ بہر حال موجود ہے تو وہ اس کا کس قدر مذاق اڑائیں گے اور وہ خود کس قدر غلطی پر ہوگا۔ جب وہ انہیں بتا رہا ہوگا کہ اس نے تمام دنیا کھنگال ڈالی ہے۔ اس بے چارے کو کیا علم کہ اس نے جس کو پوری کائنات سمجھا ہے وہ محض ایک گھر ہے اور ایسے بیسیوں گھر ایک گلی میں ہوتے ہیں۔ وہ اندازہ کر سکتا کہ وہ زمین پر ایسے ہزاروں لاکھوں شہر موجود ہیں' کائنات میں اس کی حیثیت باورچی خانے کے فرش پر گرے ہوئے چینی کے ایک دانے یا ایک بیضہ مور کی سی ہے۔ لیکن افسوس وہ اندازہ نہیں لگا سکتا اور میں اسے بتا نہیں سکتا۔ کیونکہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ہمارا آپس میں ایسا کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کا کوئی امکان ہے۔



رہائی

''میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں''

''کیوں؟''

''تا کہ تم سے نجات حاصل کرسکوں۔''

''تم مجھ سے نجات حاصل کرنا کیوں چاہتے ہو؟''

''میں تم سے اکتا گیا ہوں' تمہاری موجودگی میں میرا دم گھٹتا رہتا ہے۔''

''اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔''

''میں تم سے شروع سے ہی نفرت کرتا ہوں لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔اب میں تمہیں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔''

''تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔''

''میں ہر لمحہ مرنے کی اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ایک ہی بار مر جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ بزدلی ہے۔''

''میرے لئے اب بہادری اور بزدلی میں کوئی فرق نہیں رہا۔''

''خودکشی حرام ہے۔''

''ہاں حرام ہے لیکن تم نے بھی تو میرا جینا حرام کر رکھا ہے تم نے میرے لئے زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہنے دیا۔''

''میں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''مجھے خودکشی کے لئے بھی تمہاری اجازت کی ضرورت ہے یہی میری نفرت کا سبب ہے۔کاش میں کوئی کام تو اپنی مرضی سے بھی کر سکتا۔''

''تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ہم میں س کوئی بھی اتنا آزاد نہیں ہے۔میں تمہیں آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔کیونکہ میں خود کسی دوسرے کی مرضی کا پابند ہوں اور وہ دوسرا کسی تیسرے کا۔''

''میں کچھ نہیں جاننا چاہتا سوائے اس کے کہ مجھے کم از کم خودکشی کی اجازت تو ملنی چاہئے۔''

''زندگی ایک عطیہ ہے میں چاہتا ہوں تم زندہ رہو۔ زندگی سے لطف اٹھاؤ۔''

''لطف اٹھاؤں؟ تمہارے ہوتے ہوئے؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے تمہیں مجھے برداشت کرنا ہوگا۔''

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔''

''آخر کیوں؟''

''تم۔۔۔۔۔۔تم میرے گلے کا طوق۔۔۔۔۔۔میرے پاؤں کی زنجیر ہو۔۔۔۔۔۔تم نے میری آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔ تم نے میری روح کو مصلحتوں کے پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔ گلے میں طوق ہو پاؤں میں زجیر ہو روح پر ننگی تلوار کا پرہ! تو کوئی کیسے خوش رہ سکتا اور زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے۔''

''یہ تمہارا اور میرا۔۔۔۔۔۔ہم سب کا مقدور ہے تمہیں اس کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہوگا۔''

''میں مزید کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔ میں سمجھوتوں اور مصلحتوں کے ان گنت دریا عبور کرتے عاجز آ چکا ہوں۔ اکتاہٹ اور بیزاری نے میری زندگی کی اجیرن کردی ہے۔''

''لیکن ذرا سوچو۔۔۔۔۔۔اس کے باوجود ہونا۔۔۔۔۔۔نہ ہونے سے کس قدر افضل ہے۔''

''مجھے اپنے ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں معلوم نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ میں اذیت میں مبتلا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم پیر تسمہ پا کی طرح ردن پر سوار رہو گے تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔ خلا میں ہی رہتا۔ افسوس مجھے مٹی نے مایوس کیا۔''

''مٹی کسی کو مایوس نہیں کرتی۔''

''مٹی مایوسیوں' ناکامیوں اور اذیتوں کا احساس دلاتی ہے۔ اس کی کشش کے دائرے سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔''

''اس نے تمہیں گود لیا۔ اپنے پانیوں سے تمہارے آبیاری کی۔ اپنی ہواؤں کے جھولے میں جھلایا۔ اب تم اسے مایوسی کا طعنہ دیتے ہو' کیا یہ احسان فراموشی نہیں!''

''کاش اس نے میرے گلے میں تمہاری غلامی کا طوق نہ ڈالا ہوتا۔''

''میں تمہارے گلے کا طوق نہیں ہوں تمہاری ترقی اور بہتری کا وسیلہ ہوں۔''

''تم اس کو ترقی کہتے ہو؟''

''ہاں ۔۔۔۔۔۔ میری وجہ سے تمہیں فضیلت حاصل ہوئی۔ یاد کرو تم کیا تھے اور میں نے تمہیں کس مقام پر پہنچایا۔''

''تم نے مجھے بہت سی آسائشیں دیں۔ لیکن تم نے مجھ سے آزادی اور خود مختاری چھین لی۔''

''میں نے تم سے کچھ نہیں چھینا۔ جو کچھ تمہیں کبھی حاصل نہیں تھا فقط اس کا احساس دلایا۔''

''یہی تمہارا جرم ہے' میں بے لباس تھا لیکن عریاں نہیں تھا۔ تم نے مجھے لباس اور احساس عریانی دی۔ میں خالی ہاتھ تھا لیکن کسی محرومی کے احساس سے دوچار نہیں تا۔ تم نے میرے اردگرد چیزوں کے انبار لگا دیئے لیکن میری روح کو بے اطمینانی کے پنجرے میں قید کر دیا۔ مایوسی اور احساس گناہ سے دوچار کر کے تم نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا ہے۔''

''میں نے تمہیں جو کچھ دیا وہی تمہاری فضیلت ہے۔''

''مجھے فضیلت نہیں' خوشی درکار ہے۔''

''فضیلت بذت خود ایک بہت بڑی خوشی ہے تم اس کا احساس تو کرو۔''

''میں زندگی کے کھونٹے سے مزید بندھا رہنا نہیں چاہتا۔ میں واپس خلا میں جانا چاہتا ہوں۔''

''تم ناشکرے ہو۔۔۔۔۔۔ خلا کی بے معنی وسعتوں میں بھٹکنا چاہتے ہو!''

''وہاں سکون ہے۔ وہاں بدی کا گزر نہیں' شر کی رسائی نہیں' محرومی' مایوسی اور بے بسی کا احساس نہیں' موت کا خوف نہیں' ناانصافی نہیں' علالت و عسرت نہیں اور قید مقام نہیں۔ خلا کی وسعتیں مجھے پکارتیں ہیں۔''

''خلا کبھی کسی کو نہیں پکارتا۔۔۔۔۔۔ وہ کشش سے محروم ہے۔ وہ خوشی اور غم' محبت اور نفرت' زندگی اور موت تمام ذائقوں سے خالی ہے اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم مٹی میں رہتے ہو مگر خلا کی بانجھ وسعتں کے لئے سچی نعمتوں کے حقیقی ذائقوں کو اپنے اوپر حرام جانا ۔۔۔۔۔۔ یہ کفران نعمت ہے۔ تمہیں اس کی سزا کے لئے تیار رہنا چاہئے۔''

''یہ سزا میرے لئے ایک عظیم تحفہ ہوگی۔ اگر مجھے زمین بدر کر دیا جائے۔''

''مٹی آنے والوں کا خوش دلی سے استقبال کرتی ہے۔ ان کے ننگے بدنوں کو لباس مہیا کرتی ہے' لیکن کسی کو جانے کی اجازت نہیں دیتی۔''

''میں مٹی کو اس کا دیا ہوا لباس واپس کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سکڑ کر تنگ ہو گیا ہے۔ اس میں میرا دم گھٹتا ہے۔''

''یہ لباس تمہاری پہچان ہے۔ یہ لباس تم ہو۔ اس کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ہو۔''

''میں اپنی شناخت کھونا چاہتا ہوں۔ میں بے نام ہونا چاہتا ہوں۔ میں مشرق مغرب شمال جنوب کی قید سے رہائی چاہتا ہوں۔ میں بے سمت خلاؤں میں بھٹکنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا نام حاضری کے رجسٹر میں درج ہو چکا ہے۔''

''میرا نام حاضری کے رجسٹر سے خارج کر دیا جائے۔''

''اس رجسٹر میں جو نام ایک بار لکھا جاتا ہے اسے مٹایا یا خارج نہیں کیا جا سکتا۔ واپسی کا خیال چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔۔واپسی کے سارے راستے بند ہیں۔''

''یہ ظلم ہے نا انصافی ہے۔'' ''یہ ظلم اور نا انصافی نہیں۔ یہ زندگی کی اولین شرط ہے اور اگر یہ جرم ہے تو تم خود بھی اس کا ارتکاب کر چکے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اگر تمہیں خلا کی ویرانیاں اس قدر عزیز تھیں تو تم نے مٹی اور ہریالی کیلمس کی خواہش کیوں کی تھی اور زندگی کے سمندر میں اترتے ہی تم نے لائف بیلٹ پر قبضہ کرنے کے لئے قتل عام کیوں کیا تھا۔''

''میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تلافی کے لئے ضروری ہے کہ تم زندگی کی حفاظت کرو۔''

''جس کا انجام ناپائیداری اور فنا کے سوا کچھ نہ ہو اس کی حفاظت کیسے اور کب تک کی جا سکتی ہے۔''

''جب تک اس کا اذن ہو۔''

''کچھ بھی ہو میں رہائی چاہتا ہوں میں مٹی کا لباس اتار کر ابدیت سے ہمکنار ہونا چاہتا ہوں۔''

''کیا تمہیں بانجھ ابدیت کے کبھی نہ ختم ہونے والے جمود سے ہول نہیں آتا؟''

''وہ بلندی اور سرفرازی ہے' لامحدودیت ہے۔''

''وہ زمین سے بلند کوئی مقام نہیں' زمین خلاؤں کا عرش ہے اس سے جدا ہو کر تم پھر بے معنی' بے وقعت اور بے نام ہو جاؤ گے۔''

''لیکن یہاں تم ہو۔۔۔۔۔۔۔۔غلاشی کے سلاسل کی صورت۔''

''ہاں میں ہوں اور مجھے حکم ہے کہ تمہاری حفاظت کروں۔ میں حکم عدولی نہیں کر سکتا۔''

''لیکن میں حکم عدولی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔فرار کے تمام راستے بند ہیں۔''

''یں ایسا کروں گا۔میں اب مزید تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔تم نے اس زمین کو مصائب اور آلام کا گھر بنا دیا ہے۔تم نے یہاں طرح طرح کے تعصبات' نفرتوں اور نا انصافیوں کے بیج بوئے ہیں۔زندگی کی ہزاروں صورتیں تھیں۔لیکن تمہیں صرف اپنی صورت پسند آئی تم اپنے سوا کسی کو آزادی سے جینے کا حق نہیں دیتے۔میں اب ایک پل بھی یہاں نہیں رکوں گا۔''

''ضد نہ کرو۔۔۔۔۔۔۔اب بھی وقت ہے واپس جانے کا خیال چھوڑ دو۔''

''کیسے چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔۔کس کے لئے چھوڑ دوں؟''

''بہتے دریاؤں' اڑتے بادلوں' نگر نگر گھومتی ہواؤں' چاندنی راتوں' طلوع ہوتی صبحو' کھلتے پھولوں اور گھگھو گھوہ الاپتی فاختاؤں کے لئے۔''

''میرے لئے سب مناظر اور نغمے بے معنی ہیں۔آدمی اندر سے خوش نہ ہو تو ساری خوبصورتیاں بدصورتیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔''

''کیا تم دیکھ سکتے ہو؟''

''ہاں مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے۔لوگ' مشینیں اور اپنا جسم۔''

''پھر تم نے اس کا غم میں ڈوبا ہوا معصوم چہرہ بھی دیکھا ہوگا۔''

''ہاں' دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔یہ چہرہ مجھے ہمیشہ دھوکا دیتا رہا ہے۔''

''اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں! کیا تم نے ان آنسوؤں کو شمار کیا ہے؟''

''یہ آنکھیں گمراہ کن ہیں میں انہیں دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''نہ دیکھو۔۔۔۔۔۔۔مگر تم سن بھی تو سکتے ہو؟''

''ہاں مجھے سب کچھ سنائی دے رہا ہے۔کاش میری آواز بھی سنائی دے سکتی اور میں کہتا وہ میرے جسم کو مت چھوئے۔''

''اگر تمہیں اس کی بے گناہی کا اب بھی یقین نہیں ہے تو پھر آؤ۔۔۔۔۔۔۔ایک آواز سنو۔''

''اب۔۔۔۔۔۔۔ابو۔۔۔۔۔۔۔جی۔''

''یہ آواز۔۔۔۔۔۔۔؟ یہ کیسی آواز ہے۔۔۔۔۔۔۔کون مجھے پکارتا ہے؟''

''یہ مٹی سے تمہارے کبھی نہ ٹوٹنے والے تعلق کی آواز ہے۔''

"میں اس آواز سے رہائی چاہتا ہوں۔"

"تم اس آواز سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تمہاری اپنی آواز ہے۔"

"میں اس آواز کی پہنچ سے دور جانا چاہتا ہوں۔"

"تم اس آواز سے دور نہیں جا سکتے۔ یہ آواز ہر جگہ تمہارا پیچھا کرے گی۔"

"مجھے اس آواز کی کشش سے بچاؤ۔ میں لمحہ لمحہ نیچے گرتا جا رہا ہوں۔"

"تم نیچے نہیں گر رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔اپنے جسم میں واپس جا رہے ہو۔"

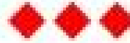
"پانی۔"

"پانی؟"

"پانی۔۔۔۔۔۔۔پانی۔"

"مبارک ہو۔۔۔۔۔۔۔ہوش آ رہا ہے۔"

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"



لوہے کا آدمی

چلتے چلتے اچانک اس پر نظر پڑتی ہے۔ میں اسے فوراً پہچان لیتا ہوں۔

''ارے واہ۔۔۔۔۔۔۔تم یہاں۔'' میں خوشی اور حیرت سے کہتا ہوں۔

وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔۔۔۔۔۔۔دے بھی نہیں سکتا۔ برسوں بعد اسے اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے جیسے پردیس میں کوئی بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہو۔ میں کل شام سے اس شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہاں ہوں۔ کل دیر سے ائیر پورٹ پہنچنے کی وجہ سے میری فلائٹ نکل گئی۔ میرا کوئی یہاں جاننے والا نہیں ہے۔ میں نے وقت گزارنے کے لئے شہر کی تقریباً سب اہم جگہیں دیکھ ڈالی ہیں۔ لیکن میری اگلی فلائٹ میں اب بھی اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔

اس وقت میں بڑے بازار کا چکر لگا کر واپس ہوٹل کی طرف جا رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے ریستوران کے سامنے میری اس پر نظر پڑی ہے اور میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا ہے کیسے نہ پہچانتا' میرا اس کا بارہ برس تک ساتھ رہا ہے۔ پھر ایک بار مجھے کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی اور میں نے اسے اپنے شہر کے ایک ڈیلر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بھول گیا۔ لیکن اب تین چار برس بعد اسے اچانک یہاں دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے جیسے میں خود اسے یہاں کھڑا کر کے تھوڑی دیر کے لئے ادھر ادھر چلا گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس خوشی کا اظہار کیسے اور کس سے کروں جو اسے اس اجنبی شہر میں دیکھ کر مجھے ہو رہی ہے۔ اس کا موجودہ مالک یقیناً اندر بیٹھا چائے پی رہا ہوگا۔ وہ کسی وقت بھی باہر آ سکتا اور اسے وہاں سے لے جا سکتا ہے۔ میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ پتہ نہیں کب ہماری اس ملاقات کا وقت ختم ہو جائے۔

میں آگے بڑھ کر اسے چھوتا ہوں اور میرے اپنے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ میں فرط محبت میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کے کان کھڑے ہو گئے ہوں اور وہ اندر ہی اندر زور زور سے ہنہنانے لگا ہو۔

کلچ کافی سخت ہو رہا ہے شاید اسے گریس کی ضرورت ہے۔ سٹینڈ میں بھی کچھ نقص معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک طرف کو جھکا کھڑا ہے۔ کافی جگہوں سے روغن اکھڑا ہوا ہے = پینڈل پر وہ ڈنٹ صاف نظر آتا ہے جو ایک بار کھمبے سے ٹکرانے کی وجہ سے پڑا تھا۔ پھر بھی اس کی مجموعی حالت زیادہ خراب نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے اندر پٹرول کی بجائے لہو گردش کرتا ہوتا تو وہ میری حالت دیکھ کر

ضرور رو پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے بہت سے سوالات بھی کرتا۔ بچھڑ جانے والوں کا حال احوال دریافت کرتا۔ وہ ان حادثوں کی تفصیل بھی جاننا چاہتا جنہوں نے میرے اندر باہر ندٹ ڈال دیے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں بھی اس سے وہ سب کچھ کہتا جو کسی سے نہیں کہہ سکتا ہوں مگر وہ کچھ نہیں پوچھتا وہ مجھے دیکھ کر ہنستا ہے نہ روتا ہے اور نہ ہی اس کے کسی حصے میں کوئی جنبش ہوئی ہے۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میں اسے خرید کر لایا اور اس پر پہلی بار سوار ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میرے پر نکل آئے ہوں۔ کئی برسوں پہلے' روزانہ گھر سے سکول تک کا بارہ میل کا فاصلہ پیدل چلتے چلتے جب مجھے پھٹیچر سی بائیسکل ملی تھی تب بھی ایسا ہی لگا تھا مگر بائیسکل نئی ہو یا پرانی چلنے کے لئے انسانی خون کا ایندھن مانگتی ہے۔ برسوں تک پیڈل مار مار کر میری ٹانگوں کا خون خشک ہو گیا اور نجانے کتنے ہی بعد میں روانہ ہونے والے مجھ سے آگے نکل نکل گئے۔

مجھے یاد آتا ہے۔ اسے خریدنے کے لئے مجھے کتنی محنت اور انتظار کرنا پڑا تھا۔ پہلی تنخواہ ہی سے میں نے اس کے لئے پیسے بچانا شروع کر دیے تھے اور کئی برسوں کا اوور ٹائم ملا کر اس تک پہنچ سکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ نیا ہی خریدوں گا۔ آدمی کے پاس کوئی چیز تو نئی بھی ہونی چاہئے۔ مجھے زندگی میں ہر چیز پرانی اور سکینڈ ہینڈ ملی تھی۔ بڑے بھائیوں کے چھوٹے پڑ جانے والے کوٹ سویٹر اور کپڑے۔ ان کے گھسے ہوئے تلووں والے جوتے۔ ان کی پڑھ پڑھ کی پھاڑی اور میلی کی ہوئی کتابیں۔ چھوٹا ہونے کے ناتے میرے لئے بازار سے بھی پرانی اور سکینڈ ہینڈ چیزیں خریدی جاتیں۔ نئی اور تازہ چیزوں کے لئے میں ہمیشہ سے ترسا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے جو محبت ملی وہ بھی فرسٹ ہینڈ نہیں تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر میرے اندر کوئی کان پر ہاتھ رکھ کر اونچے سروں میں مرزا صاحباں گانے لگتا تھا۔

دھی کھیوے دی صاحباں جس تے حوراں گھنڈ کڈھن
اوہدے پٹ چنن دیاں گیلیاں کھ کھ مشک چھڈن
اوہدے خونی نین پکھاولے بازاں وانگ تکن
اوہ پاڑن دل دلاں نوں بکیں رت پیون
اوہدے سر تے بھوچھن کاڈھواں وچ تلیئر چوگ چگن

وہ بچپن ہی سے اپنے تایا زاد سے منسوب تھی اور اس کے لئے کتابوں رسالوں سے اشعار چنتی اور اسے بھجواتی رہتی تھی اور وہ ہر صبح اس کے سرہانے بہت سے پھول اور کلیاں ڈال جایا کرتا تھا۔ لیکن پھر دونوں گھروں کے درمیان جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا اور آئے

دن گالی گلوچ کی آندھیاں اور طعنوں مہنوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ چہروں پر نفرتوں اور کدورتوں کی گرد جمنے لگی اور دل محبتوں سے خالی ہونے لگے۔ ایسے ہی خزاں کے کسی موسم میں جب اس کے دل شجر بے برگ و بار ہو رہا تھا' اس نے کسی اجنبی پرندے کی چہکار سنی۔ وہ اسے بار بار اڑاتی مگر وہ لوٹ لوٹ کر آ جاتا اور ننگی ٹہنیوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگتا۔ قریب رہنے والی چیزوں سے انس ہو ہی جاتا ہے وہ اسے دانہ دنکا ڈالنے لگی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

جب میں اچانک بریک لگاتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ' میرے ساتھ آ لگتی تھی اور میری زرہ بکتر کا لوہا پگھلنے لگتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے میں بریک شو بدلوانا پڑ جاتے تھے۔

میں چونک پڑتا ہوں۔

ریستوران سے نکل کر ایک دبلا پتلا آدمی اس طرف کو آ رہا ہے۔ شاید اس سے بچھڑنے کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ میں ایک طرف کو ہٹ جاتا ہوں مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتا۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ کچھ دیر اور اس کے ساتھ گزار سکوں گا۔ بھولی بسری باتوں کو یاد کر سکوں گا۔ بعض زخم ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی انہیں کھرچ کر خوش ہوتا ہے۔

ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مجھے ہوش میں لانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے مگر ہوش نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے ایک بوڑھی اور نحیف آواز سنی۔ اپنی ماں کی۔ پتہ نہیں کیسے بے ہوشی کے تنے ہوئے تنبو کو پار کر اس کی سسکی کی لاغری آواز میرے اندر گھس گئی تھی اور میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب ہم لمبی سیر سے لوٹے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کہا تھا:

"یہ گھر اتنی جلدی کیسے آ گیا ہے؟"

"کہو تو واپس چلیں؟"

"ہاں چلو۔"

اور ہم واپس چلے گئے تھے۔

ایک دفعہ وہ صبح کی گاڑی سے ننھیال جا رہی تھی۔ اس نے مجھے اسٹیشن پر آنے کو کہا تھا۔ لیکن میں ناراض تھا۔ دو روز پہلے کسی چھوٹی سی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی تھی۔ میں اتنی جلدی من جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ وہ بار بار خالی پلیٹ

فارم کو دیکھ کر پریشان ہوتی ہوگی۔ وہ مجھے لوہے کا آدمی کہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تھوڑی سی عمر میں بہت ساری صعوبتیں برداشت کر کے میری کھال ہی نہیں دل بھی سخت ہو گیا تھا۔ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتی لیکن پھر فوراً ہی من جاتی تھی۔ مجھے غصہ نہیں آتا تھا مگر دل میں بدگمانی یا ناراضی کی ذرا سی خراش بھی پڑ جاتی تو اسے مٹانے کے لئے مجھے کئی کئی دن کی مہلت درکار ہوتی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جاتی تھی اور چھوٹی باتوں پر رو پڑتی تھی۔ وہ ناول یا افسانہ پڑھ کر اور فلم کا المیہ سین دیکھ کر رو پڑتی۔ اس کے برعکس مجھے کبھی کسی بڑے سے بڑے حادثے پر بھی رونا نہیں آیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی:

"رونے والی بات پر رو پڑا کرو اس سے دل کا میل ڈھل جاتا ہے۔"

میں کوشش کرتا مگر مجھے رونا نہ آتا۔ ہنسی بھی نہ آتی۔ ہاں اکثر خوف آتا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اپنے آپ سے۔

میں اسٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ دل میں ایک آدھ سلوٹ ابھی باقی تھی۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا جب گاڑی چلنے کا وقت قریب آیا میرے اندر ایک انجن سا زور زور سے بھاپ نکالنے لگا۔ اگر اس روز کوئی میرے اسٹیشن پہنچنے کی وڈیو ریکارڈنگ کر رہا ہوتا تو اتنا طویل فاصلہ اتنے کم وقت میں طے کرنے پر مجھے کوئی بڑا عالمی ایوارڈ دیا جاتا یا پھر تیز رفتار اور ٹریفک اصولوں کی خلاف ورزی کے جرم میں میرا لائسنس ضبط کر لیا جاتا۔ یوں لگتا تھا میں اسٹیشن نہیں نیلی پر سوار ہو کر داناباد جا رہا تھا۔

اوہدیاں قلماں وانگ کنوتیاں اتے سوہے سبز پلان

اوہدے سنباں لاٹاں چھڈیاں جیویں آہرن چین ودان

بعد میں اس نے خود ہی بتایا تھا کہ وہ مجھ سے بہت مایوس ہو چکی تھی اور اگر میں اس روز اسٹیشن نہ جاتا تو اس نے میرے لوہے کا آدمی ہونے پر پکی مہر لگا دینا تھی اور عین ممکن تھا کہ وہ میری سکینڈ ہینڈ محبت کو اپنے ننھیال میں کوڑیوں کے بھاؤ بیچ آتی۔ مجھے یاد آتا ہے۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کہنے لگی:

"کیا تمہیں بہت جلدی ہے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر آہستہ کیوں نہیں چلاتے؟"

"کیا تمہیں ڈر لگتا ہے؟"

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔اس بات سے کہ یہ سفر جلد ختم ہو جائے گا۔''

''اچھا تمہارا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔۔''

''میرا کچھ بھی مطلب نہیں۔'' وہ جل کر بولی۔ ''بس تم اڑ کر پہنچ جاؤ۔''

''بھئی چڑھائی جو ہے آہستہ چلاؤں گا تو کیسے چڑھیں گے۔''

''میرا تو جی چاہ رہا ہے وقت تھم جائے بس۔ ہم اسی طرح۔۔۔۔۔۔۔'' اس نے سر میرے کندھے سے ٹکا دیا اور کہنے لگی: ''یہ جو سامنے بلند اور مٹیالا پہاڑ ایستادہ ہے اسے یاد رکھنا۔''

''کیوں اس کے اندر کوئی خزانہ چھپا ہوا ہے؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔اسے یاد رکھنا۔ اس کی استقامت کو یاد رکھنا۔''

پھر وہ بلند کی آواز میں پکاری۔

''پہاڑ۔۔۔۔۔۔۔تو گواہ رہنا۔''

اس کی آواز چٹانوں سے ٹکرائی' لوٹ کر آئی پھر منظر کا حصہ بن گئی۔ مجھے محسوس ہوا وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس میں یہ بڑی خرابی تھی۔ وہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھ کر رومینٹک ہو سکتی اور محض اداسی کا خیال کر کے اداس ہو سکتی تھی۔

اگلے موڑ پر اس نے رکنے کی فرمائش کی۔ میں رک گیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر ٹرکی سے پھل نکال کر کھانے لگا۔ وہ بولی:

''ایک تو تم پیٹو بہت ہو ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہتے ہو خدا کے بندے ادھر سامنے تو دیکھو۔''

''کیا ہے ادھر؟'' میں جھنجھلا کر کہا۔ ''بادل ہیں پہاڑ ہے سبزہ اور جنگل ہے۔ سب کچھ ویسا ہی تو ہے جیسا ہونا چاہئے۔''

''اور وہ نیچے بہتی ندی اور وہ۔'' وہ رک گئی پھر بولی: ''یہ تم میری طرف دیکھ رہے ہو؟''

''سچ پوچھو تو مجھے اس وقت بھی تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔ میرے لئے ان سب مناظر کی اگر کوئی اہمیت ہے تو بس یہ کہ تم ان کے درمیان موجود ہو۔''

''اُفوہ بھئی میں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی جو تم ندیدوں کی طرح مجھے ہی گھورے جا رہے ہو۔''

''میں نے سنا ہے تمہارے گھروں میں صلح ہو گئی ہے؟''

''اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔''

"پڑسکتا ہے۔"

"نہیں۔"

"سچ؟"

"ہاں۔"

میں چونکتا ہوں۔

ادھیڑ عمر کا بھاری جسم والا ایک شخص قریب کھڑا مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ اس کا موقع نہیں دیتا۔ چابی گھما کر ہینڈل سیدھا کرتا اور کک لگاتا ہے اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا ایک طرف کو چلا جاتا ہے۔

میرا دل کسی انجانی زنجیر میں بندھا کھنچتا چلا جاتا ہے۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں اس کی سرخ بتی دکھائی دیتی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

میرے اندر بہت سی چھوٹی بڑی گراریاں چلنے لگتی ہیں۔ میں خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آدمی آخر آدمی ہوتا ہے۔ چاہے لوہے کا ہو۔ اس کے اندر پٹرول نہیں لہو جلتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ عجیب خفت سی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آتا ہے کہ رونے والی بات پر رو لینا چاہئے اس سے دل کا میل دھل جاتا ہے اور میں کہ کبھی نہیں رویا تھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہوں۔



سارنگی

میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔

عمر کے اس حصے میں جب لطیف اور نازک جذبے سرد پڑ جاتے ہیں اور آدمی کے اندر کا بیل تھک کر تھان پر بیٹھا جگالی کر رہا ہوتا ہے۔ اسے ڈچکروں اور ٹھوکروں سے حرکت میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسے ہلانے جلانے کے تابڑ توڑ ڈنڈے برسانا پڑتے ہیں۔

اس کی موت کی خبر سن کر مجھے صدمہ ضرور ہوا جیسے بیٹھے بٹھائے اچانک کسی نے ٹھوکر ماردی ہو۔ میں چونکا اور پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر میرے سینگوں پر دھرتی کا بوجھ تھا لیکن جب سے معلوم ہوا کہ اس نے آخری روز سارنگی سننے کی خواہش کی تھی تو میرے اندر کوئی چیز زور سے اچھلی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں حرکت ہوئی برسوں سے رکا رہٹ سا چلنے لگا۔

آر ناتگاں پار ناتگاں وچ ٹل مطلیاں
اوّن کونجاں دیھن بچے ندی نہاون چلیاں

میں نے تھوڑی دیر کے لئے دھرتی کو سینگوں سے اتار کر رکھا اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا پیچھے ۔۔۔۔۔۔ دور تک ۔۔۔۔۔۔ گئے دنوں کے غبار پھیلا ہوا تھا۔

اس غبار میں بہت سی چیزیں چھپ گئی تھیں۔ بہت کچھ دھندلا گیا تھا۔ مگر بہت سی چیزیں اور چہرے اب تک صاف نظر آتے تھے ۔۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ میری سماعت کا زنگ بھی اترنے لگا اور مجھے بھولی بسری آوازیں سنائی دینے لگیں۔

مچھروں کی گھوکریں، جھینگروں اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں اور ان سب آوازوں پر اوور لیپ ہوتی ڈھول کی تھاپ اور گانے کی کچی پکی آوازیں، جیسے ریشم سوت اور سیتل وول کے تار آپس میں الجھ گئے ہوں۔

ہر رات ایک جیسے گیت گائے اور دہرائے جاتے۔ کبھی کبھی ڈھولک بجانے والی تھک کہ بھٹک جاتی تو سب کچھ بے سرا ہو جاتا۔ لگتا ریل گاڑی پٹڑی سے اتر گئی ہے۔ لیکن پھر چند ہی روز میں ان ان گنت آوازوں کے شور میں سے ایک ایسی کومل آواز دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا جسی ساون اساڑھ کے مہینوں میں آرام کے پیڑوں سے سنائی دیتی ہے۔ اس خوشبو آواز کو بھانت بھانت کی آوازوں سے الگ کرنا آسان کام نہ تھا۔ میں نے زرگر کی دکان کا کوڑا کرکٹ خریدنے والے ٹھٹھیاروں کو تالاب کے کنارے نتھار

نتھار کر سونے کے باریک ذرات تلاش کرتے دیکھا تھا۔لیکن خود اس قسم کے کسی تجربے سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے لگتا بار بار مجھ سے کوئی قیمتی نگینہ ریت کے انبار میں کھو جاتا ہے اور مجھے ہر بار نئے سرے سے ساری ریت چھاننا پڑ جاتی۔

میں سماعت کی چھانی سے ریت کے انبار چھان کر ہلکان ہو جاتا تب کہیں آوازوں کے درمیان یا آخر میں اس جان لیوا کا ہلکا سا جھونکا آتا اور مجھے کپکپا دیتا۔

اندر باہر کوئلیں کوکنے اور وائلنیں بجنے لگتیں۔

مجھے وائلن کی آواز بہت اچھی لگتی تھی۔اتنی اچھی کہ لگتا مجھے سماعت محض اسی کے لئے تفویض ہوئی ہے۔

وہ خوشی اور مسرت کے گیت ہوتے ان کی طرزیں اور بول طربیہ ہوتے مگر اس آواز میں عجیب طرح کا حزن اور سوز تھا جیسے کوئی کوک پکار رہا ہو جیسے کہیں سے ہوک اٹھ رہی ہو۔ مجھے اس اداس کر دینے والی آواز میں اتنی اپنائیت محسوس ہوتی کہ لگتا یہ آواز میری ہی تلاش میں کرلاتی پھرتی ہے۔پھر وہ آواز حسن کے ایک پیکر میں ڈھل جاتی۔ میں وہ آواز کے ریشم کا تار پکڑ کر اس پیکر تک پہنچنے کی سعی کرتا مگر ہر بار تار ٹوٹ جاتا اور میں گر کر چکنا چور ہو جاتا۔

گھر کی سب سے اونچی چھت پر لیٹے لیٹے میرے چاروں طرف اضطراب کا جنگل پھیل جاتا۔درد کے بلند پیڑوں اور دکھوں کی جھاڑیوں کے درمیان رات بھر میں آواز کے کوندوں سے لکن میٹی کھیلتا۔اس کی ایک تان مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیتی۔لگتا قوس قزح کی پینگ کا لمبا ہلارا آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔بھوں سے چڑھ جاتے۔

میں نے اس آواز کے ساتھ اتنی پٹخنیاں کھائیں کہ مجھے سب کچھ بھول گیا۔ دوستوں کی صحبتیں، رقص و موسیقی کی محفلیں، ریستورانوں کے کیبنوں میں بیٹھ کر کی گئی سرگوشیاں اور عہد و پیمان۔

وہ آواز گھنگھور گھٹا بن کر میرے دل کی فضا پر محیط ہو گئی۔اس نے میرے سکون کے توتے کر دیئے۔میری بے فکری اور فراغت کی جوان جہان نیندوں کے پرزے بکھیر دیئے۔میں رات بھر جاگتا اور دن بھر اونگھتا اور سنسان دوپہروں میں بچھڑی ہوئی آواز کے جگنو تلاش کرتا۔

کئی بار جی میں آیا کسی سے اس کا نام پوچھا جائے گا مگر کس کا؟ کیا پتہ دوسروں کو سب آوازیں ایک جیسی لگتی ہوں۔

میں گاؤں میں اجنبیوں کی طرح تھا۔میرا زیادہ تر وقت شہر میں گزرا تھا۔پھر بھی میں بہت سے چہروں سے آشنا تھا۔مگر میں ہر چہرہ دیکھ کر وثوق سے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ایسی صورت میں آواز سے نام اور چہرہ دریافت کرنا قریباً ناممکن تھا۔

ایک روز وہ لڑکی جس کی شادی ہو رہی تھی ہمارے ہاں آئی سوچا اسی سے پوچھ لوں مگر وہ مجھ سے بہت شرماتی تھی۔ میں بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سرخ ہو جاتی' چپ رہتی یا بھاگ جاتی۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ اس کا بیاہ ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ خود نہیں گاتی ہو گی لیکن پھر پتہ چلا کہ اس کے بھائی کا بیاہ بھی ایک ساتھ ہو رہا ہے اس لئے وہ گانے والیوں میں پیش پیش ہے۔ میں نے کھوج لگانے کی کوشش کی تع معلوم ہوا' اس کی آواز اچھی ہے اور سب سے زیادہ گیت یاہیں۔ خیال ہوا کہیں۔۔۔۔۔۔۔ وہی تو نہیں مگر ٹھیک سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک روز وہ بھائی کی ہونے والی دلہن کے لئے خریدے گئے ملبوسے اور زیور دکھانے آئی تو اس نے امی کو اس طرح گنگنا کر دور سے پکارا کہ میرے اندر توپ سی دغی۔۔۔۔۔۔۔ بدن میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس کی خوبصورتی میں آواز کا حسن جمع کرنے کے بعد اعداد و شمار میرے بس سے باہر ہو گئے۔ اس روز وہ مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کافی دیر تک موجود رہی اور شاید منتظر بھی تھی کہ میں اس سے بات کروں مگر مجھ سے بولا نہ گیا یہی خوف رہا کہ کہیں لفظوں کی بجائے کلیجہ باہر نہ آ جائے۔

ایک روز سارنگی کے ساتھ گا کر مانگنے والا دولو فقیر دروازے پر آیا۔ میں نے سارنگی کی آواز پہلے بھی سنی تھی مگر گھاؤ تازہ ہونے کی وجہ سے لگتا تھا' پہلی بار سن اور سہہ رہا ہوں۔ میں نے اسے اندر بلا لیا اور اپنے پاس بٹھا کر صرف سارنگی سنانے کی فرمائش کی۔

دولو نوجوان تھا لیکن اسے سارنگی بجانے میں استادانہ مہارت تھی۔۔۔۔۔۔۔ مجھے وائلن کی آواز مضطرب کر دیا کرتی تھی۔ لیکن آج اک سارنگی کی آواز نے مجھے وارفتہ کر دیا۔ عین اس وقت جب سارنگی کی آواز میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ باہر کا دروازہ کھلا اور وہ چادر اوڑھے اندر آئی۔۔۔۔۔۔۔ یک نہ شد دو شد۔۔۔۔۔۔۔ میرا اندر باہر چھلنی ہو گیا۔ امی پسار میں تھیں وہ سیدھی اندر چلی گئی کچھ دیر پسار میں گم رہی پھر خلاف توقع برآمدے کے دوسرے سرے پر کونے میں بیٹھ گئی اور آنکھوں کے سوا چادر میں خود کو لپیٹے سارنگی سننے لگی۔

سارنگ سرگوشیاں کرتی کبھی سسکتی' کبھی رو کر پکارتی۔

سارے گھر میں کویلیں کرنے لگیں۔ فاختائیں گھگھو گھو الاپنے لگیں۔ پپیہے بولنے لگے۔ چاروں طرف ڈھولوں کی گھمکاریں سنائیں دینے لگیں۔

تیرے حسن دے ڈھولاں دی ہمب بولے دھراہ دھراہ دو دلبر واسطہ ای

میرے اندر کوئی فراقیہ چھتاں لکھنے لگا۔

سارنگی وہ چٹھیاں ساتھ ساتھ مکتوب الیہ تک پہنچاتی رہی۔

درد کا دریا چڑھتا گیا اور ہر طرف جل تھل ہو گیا۔۔۔۔۔۔آہستہ آہستہ روحوں پر چڑھے غلاف اترنے لگے اور اچانک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ پھر لگا کہ ضبط اور احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اور سارنگی سے بھی اونچی آواز میں رونے لگے گی۔ معاً وہ اٹھی اور بچے کھچے آنسوؤں سمیت باہر نکل گئی۔

یہ میری اس سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

اگلے روز ماں یوں بیٹھ گئی۔

تیل مہندی۔۔۔۔۔۔گھڑا گھڑولی۔۔۔۔۔۔شہنائی۔۔۔۔۔۔برات اور رخصتی۔ جس روز اس کی ڈولی نکلی میں گھر پر اکیلا تھا۔ امی دن بھر شادی والے گھر میں پھر مجھے نیند آ گئی۔

لمبی اور گہری نیند۔

جب میری آنکھ کھلی پچیس سال بیت گئے تھے۔

وہ جو اسے رخصت کرنے گئی تھی خود بھی رخصت ہو چکی تھی۔

اس گھر میں اب دوسرے لوگ رہتے تھے۔

بہت کچھ اتھل پتھل ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ بچھڑ گئے تھے بہت سے نئے لوآ ملے تھے۔ کچھ عرصہ تک مجھے سارنگی کی آواز اچھی لگتی رہی۔ پھر اس کی جگہ دوبارہ وائلن نے لے لی۔ پھر میرے ذوق میں اور وسعت آئی اور مجھے پیانوں اور الیکٹرک گیٹار کی آوازیں بھی اچھی لگنے لگیں اور میں سارنگی کو بالکل بھول گیا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ سارنگی کو کبھی نہیں بھولی تھیٹ یقیناً اسے وہ سب چٹھیاں بھی زبانی یاد ہوں گی جو اس نے سارنگی کی زبان سے سنی تھیں۔

میرا جی چاہتا کوئی مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتائے۔ وہ کیسے رہتی تھی۔ کیا سوچتی تھی۔ سارنگی کی آواز سن کر اس پر کیا بیتتی تھی۔ لیکن کوئی تفصیل سے نہیں بتاتا تھا۔ اتنا سب کو معلوم تھا اسے سارنگی کی آواز پسند تھی اور جب بھی سارنگی بجاتا کوئی فقیر دروازے پر آتا وہ لپک کر دروازے پر آ جاتی اور اوٹ میں کھڑی دیر تک سارنگی کی آواز سنتی رہتی۔ ان خوش قسمت بھکاریوں میں وِلو بھی شامل تھا جو دوسرے تیسرے مہینے اس کے گاؤں خیرات لینے اور سارنگی سنانے جاتا تھا۔

اس کی موت کی خبر سن کر میرے اندر ایک عجیب سی خواہش مچلنے لگی۔

آدمی کو زندہ رہنے کے لئے خواہشوں کے کیسے عجیب و غریب منطقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہی باتیں جو عمر کے ایک حصے میں آدمی اپنے قریبی دوستوں سے بھی چھپاتا ہے' عمر کے ایک خاص دور میں پہنچ کر جب جذباتی دلچسپیوں اور وابستگیوں کے تمام دروازے ایک ایک کر کے اس پر بند ہوتے چلے جاتے ہیں' اس کا جی چاہتا ہے گزرے ہوئے دنوں کی جذباتی وابستگیوں کے افسانے ہر کسی کو سنائے۔ شاید عمر کے اس حصے میں جذباتی حوالے سے آدمی کے پاس خود پر ناز کرنے کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

میرا جی چاہتا سب کو پتہ چل جائے اسے سارنگی کیوں پسند تھی۔ لوگوں میں چرچے ہوں۔ گھر گھر اس بات کا تذکرے ہوں۔ میری خاطر اس کے اندر ہی اندر سلگنے اور گھل گھل کر مر جانے کی داستان اخباروں میں چھپے۔ نظمیں اور کہانیاں لکھی جائیں۔ نوجوان مجھ پر رشک کریں۔ میں جدھر سے گزروں لوگ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھیں اور آپس میں سرگوشیاں کریں۔

یہی خواہش مجھے کھینچ کر گاؤں لے گئی اور میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ دولو کو اس کے احوال کا بہت کچھ پتہ ہوگا۔ اس خیال سے میں نے اگلے روز اسے بلوایا۔ دولو کے سر اور ڈاڑھی کے بال ہی نہیں بھنوئیں تک سفید ہو چکی تھیں اسے دیکھ کر مجھے اپنے بڑھاپے کا احساس شدید ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کانپتے تھے اور جسم ناتوانی کے سبب نہایت کمزور ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔

''جی میں دوسرے تیسرے مہینے اس طرف کا پھیرا ضرور لگاتا تھا۔ بڑی نیک اور سخی عورت تھیں ۔۔۔۔۔۔۔ میں جب بھی اس طرف جاتا تو سیدھا ان کے دروازے پر جا کر سارنگی بجانے لگتا۔ فوراً آ جاتیں۔ آہٹ سے پتہ چلتا آ گئی ہیں۔ آخری روز بھی سارنگی سننے کی خواہش کی۔ چودھری نے میرے پیچھے آدمی بھی دوڑایا ۔۔۔۔۔۔۔ مگر جی میں قسمت کا مارا دریا پار گیا ہوا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا اوپر سے بے وقوفی ہو گئی جی ۔۔۔۔۔۔۔ تیسرے چوتھے روز واپس آیا تو سیدھا دروازے پر جا کر سارنگی بجانے لگا اندر سے آواز آئی ''کہیں اور جا کر بجاؤ بابا' یہ ماتم والا گھر ہے ۔۔۔۔۔۔۔ جیسے میرے تو جی جوش اڑ گئے۔''

اس کی آواز بھرا سی گئی تھی۔ میں نے ازرہ تجسس پوچھا:

''کیا تمہیں معلوہے کہ اسے سارنگی کیوں پسند تھی؟''

''کوئی دکھ تھا جی ان کے دل میں ۔۔۔۔۔۔۔ اندر ہی اندر۔''

''کیا دکھ تھا ۔۔۔۔۔۔۔ تم اتنے برس آتے جاتے رہے کبھی اندازہ ہوا؟''

''اندازہ؟'' دولو رونے کے انداز میں ہنسا۔ پھر کہنے لگا: ''یاد ہے آپ کو جب ان کی شادی ہو رہی تھی!''

''ہاں یاد ہے۔۔۔۔۔۔'' میرا دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔۔ دولو نے کہاں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

''اس روز میں اتفاقاً آپ کو نہیں مل گیا سارنگی سنانے۔''

''کیا مطلب؟''

''میری تو زبان سارنگی ہی تھی جی۔''

''تمہاری زبان۔۔۔۔۔۔ سارنگی؟''

''چھوڑیئے میاں صاحب۔۔۔۔۔۔ اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔''

''مجھے بتاؤ دولو۔۔۔۔۔۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''بیشتن نے منع کیا تھا جی۔۔۔۔۔۔ ویسے بھی کیا فائدہ۔''

''فائدہ نقصان کو چھوڑو۔۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ سارنگی اسے کیوں پسند تھی۔۔۔۔۔۔''

''وہ جی ہر دکھی دل والے کو پسند ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ تو جی دکھی روح لے کر دنیا میں آئی تھیں۔۔۔۔۔۔ بچپن ہی سے انہیں سارنگی کی آواز اچھی لگتی تھی۔ پھر انہیں دیکھ کر میرے ہاتھوں میں درد زیادہ آ جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ بس جی میں زندگی بھر بجاتا رہا وہ سنتی رہیں۔۔۔۔۔۔ نہ انہوں نے کبھی کچھ کہا نہ میں نے۔۔۔۔۔۔ صرف ایک بار کہنے لگیں۔

''دولو تم خوش قسمت ہو تمہارے حصے کا رونا سارنگی رو دیتی ہے اور یہ سارنگی مجھ سے بہتر ہے کہ اپنا احوال تو کہہ سکتی ہے۔''

دولو نے اور بھی بہت کچھ کہا شاید اسے زندگی میں پہلی بار اس کا موقع ملا تھا۔ لیکن مجھے اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔۔۔۔ آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھیں اور چیزیں اور چہرے ماضی کی دھول میں چھپتے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس غبار میں سب کچھ چھپ گیا۔ اور میرے پاس یادوں کی جگالی کرنے کے لئے بھی کچھ نہ بچا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ دروازے پر کبھی کوئی بھولا بھٹکا سارنگی بجاتا فقیر آ نکلتا ہے تو میں اوٹ میں کھڑے ہو کر دیر تک سنتا رہتا ہوں۔



گیارھواں میل

''آخر بات کیا ہوئی تھی انہوں نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا؟''

''بس یار کیا بتاؤں بڑی معمولی بات تھی مگر کچھ عجیب سی۔''

''مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''پہلے تمہارے لئے چائے نہ بنالاؤں؟''

''گولی مارو چائے کو۔۔۔۔۔۔یہ کوئی چائے پینے کا موقع ہے مجھے تو سنا گھر دیکھ کر وحشت ہورہی ہے۔''

''مگر یہ تو لمبا قصہ ہے۔''

''او ہو تم شروع کرو گے تو ختم ہوگا نا۔''

''اچھا سنو۔۔۔۔۔۔یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں ضعیف العقیدہ آدمی نہیں ہوں۔''

''جی ہاں مجھے معلوم ہے آپ نے طبیعات میں ایم ایس سی کیا ہے۔''

''یار! میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں غیر عقلی اور فوق الفطری باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔''

''اچھا تو بھابھی نے کوئی سائنٹیفک بات کہہ دی؟''

''تم سنو تو۔۔۔۔۔۔میں کہہ رہا تھا کہ اگرچہ میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا مگر زندگی میں بعض واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی کی کوئی منطقی یا سائنسی توجیح نہیں کرسکتا۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہے۔''

''میں سن رہا ہوں۔''

''شہر سے مغرب کی طرف نہر والے پل سے ایک سڑک میرے ننھیالی گاؤں کو جاتی ہے۔ میں اس سڑک پر جب بھی سفر کرتا گیارھویں اور بارھویں میل پتھر کے درمیان کوئی نہ کوئی چھوٹا یا بڑا' معمولی یا غیر معمولی واقعہ ضرور پیش آتا۔''

''اچھا یا برا؟''

''عموماً ناخوشگوار۔۔۔۔۔۔اس بات کا احساس مجھے کئی برسوں کے تجربے اور مشاہدے کے بعد ہوا۔ اگر میں بس پر سوار ہوتا

تو اس کا ٹائر پنکچر ہو جاتا یا بریک فیل ہو جاتے اور وہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچتی۔ اگر میں سکوٹر یا موٹر سائیکل پر سفر کرتا تو سڑک کے اس ٹکڑے پر کسی جگہ پلگ میں کچرا آ جاتا۔ یا کلچ یا گیئر کی تار ٹوٹ جاتی۔۔۔۔۔۔ ایک دفعہ مجھے اسی جگہ تیز آندھی نے آ لیا اور میں کھائی میں گرتے گرتے بچا۔"

"کافی پرانی بات ہے جب تمہارے پاس سکوٹر تھی۔"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ جب میں نے گاڑی خرید لی اور ایک بار گرمی کی چھٹیوں میں بیوی بچوں کو لے کر گاؤں گیا تو عین گیارہویں اور بارہویں میل کے درمیان پہنچ کر انجن سے دھواں نکلنے لگا اتر کر دیکھا تو ریڈی ایٹر میں سوراخ ہو گیا تھا اور سارا پانی بہہ چکا تھا۔"

"اس کھٹارہ کو لمبے روٹ پر لے جانے سے پہلے اچھی طرح چیک کرا لینا تھا یہ تو تمہاری اپنی غلطی تھی۔"

"ہاں میری غلطی تو تھی مگر سوال یہ ہے کہ عین اسی جگہ پہنچ کر کیوں ایسا ہوا۔ پھر یہی نہیں' اس روز ہم وہاں سے بار بار پانی ڈالتے گاؤں پہنچے۔ اگلے روز گاڑی ٹھیک کرائی۔ مگر واپسی پر پھر اسی جگہ پہنچ کر فین بیلٹ ٹوٹ گیا۔ کہو یہ بھی میری غلطی تھی؟"

"اچھا خیر پھر کیا ہوا؟"

"اس طرح کے واقعات جب بار بار پیش آئے تو میں چونکا اور سڑک کے اس حصے پر سفر کرتے ہوئے ڈرنے اور محتاط رہنے لگا۔ ایک دفعہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا اور ہم بس میں بیٹھے خطرے کی حد پار کر رہے تھے کہ کسی مسافر کا کنڈیکٹر سے پیسوں کے لین دین پر جھگڑا ہو گیا اور مسافر نے غصے میں آ کر ایسی غلیظ گالی بک دی کہ اپنی چھوٹی بہن کی موجودگی کی وجہ سے مجھے شرم سے پسینہ آ گیا۔"

"بھئی خوب۔۔۔۔۔۔ یہ بھی اس سڑک کا قصور تھا گویا۔"

"میں نہیں جانتا کس کا قصور تھا۔ مگر سڑک کا یہ ٹکڑا میرے لئے ایک خاص اہمت اختیار کر گیا مجھے برے برے خیالات ستاتے' کہیں اس جگہ کی مٹی مجھے اپنی طرف تو نہیں بلاتی۔ اور کہیں آخر کار کسی حادثے کا شکار ہو کر مجھے یہیں کہیں ہلاک تو نہیں ہو جانا۔ اور اگر ایسا تھا تو یہ قبل از وقت از ارے کون کرتا تھا اور کیوں۔ ظاہر ہے میں اس سڑک پر سفر کرنا ترک نہیں کر سکتا تھا زیادہ نہیں تو نیکی بدی کے موقعوں پر تو ننھیال جانا ہی پڑتا تھا۔ پھر بھی میری کوشش ضرور ہوتی گھوم کر کسی اور رستے جاؤں اور اگر جانا ایسا ضروری نہ ہو تو ملتوی کر دوں۔"

"مگر تم نے کبھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا؟"

ہاں۔۔۔۔۔۔ میں اسے اپنا وہم ہی سمجھتا تھا۔ تم سے کہتا تو تم بھی اسے میرا وہم ہی سمجھتے۔"

''میں تو اب بھی یہی سمجھتا ہوں یہ سارا نفسیاتی مسئلہ ہے اگر تم اس سڑک پر سفر کے دوران میں اپنی حسیات کو اس قدر بیدار نہ رکھتے اور ہر لمحے چوکنے نہ رہتے تو تمہیں بہت سی ناخوشگوار باتوں کو سڑک کے اس ٹکڑے سے وابستہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔اچھا خیر تم آگے بتاؤ پھر کیا ہوا۔''

''میں نے شعوری طور پر کوشش شروع کر دی۔دوران سفر خود کو مطالعہ میں مصروف رکھتا یا آنکھیں بند کر لیتا اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ہو جاتا۔بعض اوقات تو بہت ہی معمولی سی بات ہوتی کوئی مسافر بس پر چڑھتے یا اترتے پاؤں کچ دیتا کوئی ہم سفر کھڑکی سے باہر تھوکتا تو ہوا سے تھوک اڑ کر میرے منہ پر آ پڑتا۔۔اس کے باوجود میں نے اپنے وہم سے چھٹکارا پانی کی کوشش جاری رکھی۔''

''تم وہاں کبھی اترتے نہیں۔میرا مطلب ہے اس علاقے میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا کہ تاریخ جغرافیہ کیا ہے؟''

''کئی بار ارادہ کیا کہ اس علاقے کا سروے کروں اور آس پاس کی آبادیوں' ویرانوں' قبرستانوں اور لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اندازہ لگاؤں کہ میرا اس علاقے سے کیا تعلق ہے اور یہ بھی دیکھوں کہ کہیں کوئی تخریبی طاقت تو جاگزیں نہیں ہے۔کتابوں میں پڑھی اور سنی سنائی فضول فضول باتیں ذہن میں آتیں کوئی دشمن یا حاسد مجھے نقصان پہنچانے کے لئے وہاں بیٹھا چلہ نہ کاٹ رہا ہو۔جادو ٹونا نہ کر رہا ہو۔''

''آخر آ گئے نہ راہ راست پر۔''

''بالکل نہیں۔میں ایسی باتیں سوچتا ضرور تھا مگر مجھے اب بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں ہے۔اس وقت بھی نہیں تھا بس یوں سمجھ لو یقین نہ رکھتے ہوئے بھی شک اور موہوم سا ایک خدشہ دل کے کسی کونے میں موجود تھا۔''

''پھر کیا ہوا۔''

''پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔میں ننھیال سے ایک گھی کا ٹین لے کر لوٹ رہا تھا۔لنڈ یکٹر نے اسے چھت پر رکھوا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ شہری محصول چونگی پر اتر کر اس کا محصول ادا کرنا ہوگا۔''

''ہاں سات نمبر چونگی آتی ہے اس سڑک پر۔''

''ہاں وہی سات نمبر چونگی پر محصول ادا کرنے کے لئے اترا۔''

''وہ تو شہر کے باہر تیسرے چوتھے میل پر واقعہ ہے اس کا اس گیارہویں میل سے کیا تعلق۔''

''تم سنو تو۔۔۔۔۔۔۔''

''چلو کہو۔''

''محصول دینے لگا تو احتیاطاً ایک نظر گھی کے ٹین کو دیکھ لینا چاہا مگر یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے کہ بس کی چھت پر ٹین موجود نہیں تھا۔ کنڈیکٹر اور مسافروں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ دو سٹاپ پیچھے جو سواریاں اتری تھیں' انہوں نے گھی کے کچھ کنستر اتارے تھے۔ کنڈکٹر نے ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔''

''جب وہ لوگ اپنے اور تمہارا کنستر اتار رہے تھے تم کہاں تھے؟''

''یار میں اس سڑک کی نحوست سے خود کو بچانے کے لئے آنکھوں پر رومال رکھے اونگھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا بے خبری میں سڑک کا وہ حصہ گزر جائے۔''

''بے خبری میں مبتلا ہونے میں تو تم خوب کامیاب ہوئے۔''

''خیر ڈرائیور اچھا قدمی تھا کچھ سواریوں نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا اور وہ بس واپس لے جانے پر رضا مند ہو گیا اور مجھے گیارہویں میل کے درمیان ایک سٹاپ پر اتار کر بس واپس چلی گئی۔ میرے لئے اب اس بات میں شک اور شبے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ یہ جگہ میرے لئے واقعی نحس تھی اور میرے شکوک محض واہمہ نہیں تھے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ گھی کے کنستر کو بلا ٹلنے کے سلسلے کا صدقہ یا قربانی سمجھوں اور لوٹ جاؤں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بڑی مشکل یا مصیبت میں پھنس جاؤں مگر تمہیں پتہ ہے ایک تو اباجی بناسپتی گھی نہیں کھاتے تھے۔ دوسرے سوچا کہ اگر موقع ہاتھ آ ہی گیا ہے تو ضرور اس جگہ کے اسرار کو جاننا چاہئے۔''

''یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا۔''

''بس اسٹاپ سنسان پڑا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب ہری بھری فصلیں تھیں۔ ایک پیدل چلنے کا کھلا سا راستہ تھا میں اس پر چلنے لگا۔ میں بے حد چوکنا تھا۔ کہیں پتا بھی ہلتا تو میں ٹھٹھک جاتا۔ طرح طرح کے خدشات دل میں سر اٹھاتے کہیں کسی کھیت سے نکل کر کوئی ڈاکو یا جانور حملہ نہ کر دے۔ کسی بل سے کوئی زہریلا سانپ نہ نکل آئے کسی باؤلے کتے کا سامنا نہ ہو جائے۔''

یار تم گاؤں کے رہنے والے ہو پھر اتنا ڈرے۔''

''ڈر تو میرے اندر ایک مدت سے چھپا ہوا تھا اس سارے علاقے کے بارے میں ورنہ عام حالات میں مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔''

''اچھا تو پھر کیا ہوا؟''

''کوئی ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد چند راہ گیروں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پتہ چلا کہ دیہاتوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ جن کے

پاس گھی کے چند کنستر بھی تھے' سیم نالے کے پل کے قریب جاتا دیکھا گیا ہے۔سیم نالے کا پل زیادہ دور نہیں تھا۔میں نے اپنی رفتار بڑھادی اور لوگوں سے پوچھتا ہوا کوئی تین کوس کا فاصلہ طے کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا اور ان لوگوں کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا جو ابھی ابھی گھر پہنچے تھے۔''

بڑی ہمت کی تم نے۔۔۔۔۔۔۔تمہیں دیکھ کر پریشان تو ہو گئے ہوں گے؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔سہ پہر کا وقت تھا ایک نیم شکستہ مکان کے کھلے دالان میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔قریب ہی سامان رکھا تھا۔میرا ٹین بھی وہاں پڑا تھا۔بڑی عمر کی ایک صحت مند عورت پیڑھی پر بیٹھی تھی۔درمیانی عمر کی دو عورتیں اور تین مرد قریب ہی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ایک آدمی چولہے کے پاس بیٹھا حقے کی چلم تازہ کر رہا تھا اور سانولے رنگ کی ایک نوکوان لڑکی سب کو باری باری لسی پلا رہی تھی۔دروازہ کھلا ہوا تھا میں سیدھا اندر چلا گیا اور وہ مجھے دیکھ کر چونکے اور پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ تم وہاں پہنچ جاؤ گے۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔بڑے حیران ہوئے۔چارپائیوں پر بیٹھے مردوں میں سے ایک جو نسبتاً زیادہ عمر کا تھا اٹھ کر آگے آیا اور بولا: آؤ بابو جی اندر آجاؤ۔''

''اندر تو تم آہی چکے تھے۔''

''بڑی عمر کی عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ کہے سنے میرے گھی کے کنستر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی ''بس چلی گئی تو ہمیں پتہ چلا یہ ہمارا ٹین نہیں ہے۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں کیا کہتا مجھے پیاس لگی تھی۔تھکا ہوا بھی تھا۔انہوں نے بیٹھنے کو کہا۔میں بیٹھ گیا۔پہلے انہوں نے دودھ کی لسی پلائی پھر میرے منع کرنے کے باوجود چائے بنانے لگے۔بار بار کہتے کہ مجھے جو تکلیف ہوئی ہے اس کا انہیں افسوس ہے اور انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔''

''اور تم نے یقین کر لیا۔''

''ہاں مجھے یقین ہو گیا کہ غلطی سے ایسا ہوا تھا ورنہ وہ لوگ ایسے نہیں تھے وہ مجھ سے جلد ہی گھل مل گئے اور آپس میں تفصیلی

تعارف ہوا۔ بڑی عمر کی عورت نے مجھے بتایا کہ وہ گھی کے کنستر اپنی بیٹی کی شادی کے لئے دوسرے گاؤں سے خرید کر لائے تھے۔ اگلے چاند کی تیرہ تاریخ کو ان کے ہاں بارات آنے والی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اس شادی میں شامل ہوں۔ میں نے مروتاً وعدہ کرلیا۔ لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر ان کا ایک آدمی کنستر اٹھا کر مجھے سڑک پر چھوڑنے آیا۔"

"پیدل؟"

"ہاں ادھر کوئی تانگہ وغیرہ نہیں تھا۔ غریب لوگ تھے۔ کوشش کرتے رہے کہ گھوڑا یا سائیکل کہیں سے مانگ لائیں مگر کچھ نہ ہوسکا بہرحال جب میں سڑک پر آیا' زام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بس میں بیٹھا تو مجھے اس لڑکی کا خیال آیا جس نے میرے لئے چائے بنائی تھی اور جس کی شادی میں شرکت کا میں نے اوپر سے دل سے وعدہ کیا تھا۔"

"کوئی خاص بات تھی اس میں؟"

"ہاں ۔۔۔۔۔۔ یوں تو گاؤں کی ایک عام سی معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی اس کے مقابلے میں اس کی بھاوجیں زیادہ خوبصورت اور صحت مند تھیں مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اسے پہلے سے جانتا ہوں اور اسے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ اگرچہ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی اور نہ ہی میری طرف غیر معمولی طریقے سے متوجہ ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اپنائیت موجود تھی بالکل ایسی جیسی کسی پرانے جاننے والے یا قریبی رشتہ دار کی آنکھوں میں ہوسکتی ہے۔"

"تمہاری کسی سابقہ محبوبہ سے شکل ملتی ہوگی۔"

"نہیں یار مذاق کی بات نہیں۔ اسے دیکھ کر کوئی ایسا ویسا خیال میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ بس مجھے وہ اچھی لگی اور کچھ پر اسراری بھی۔ اور گیارہویں اور بارہویں میل کے درمیان پیش آنے والے مختلف واقعات کی روشنی میں میں یہ فیصلہ کرنے میں شاید حق بجانب تھا کہ میری دیرینہ الجھن کا اس لڑکی سے ضرور کوئی تعلق چنانچہ میں نے گھر پہنچتے پہنچتے طے کرلیا کہ اس کے بیاہ پر ضرور آؤں گا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"پھر تم گئے شادی پر؟"

"نہیں ۔۔۔۔۔۔ میرا ارادہ ضرور تھا کہ میں فرزانہ کو بھی ساتھ لے چلوں مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز شادی تھی اسے گردے کا درد ہوگیا اور نھا پہلے ہی بخار میں مبتلا تھا۔ تمہاری بھابی نے اس لڑکی کے لئے جوڑا بھی بنایا ہوا تھا اور چھوٹی موٹی کچھ دوسری چیزیں بھی

خریدی ہوئی تھیں کہنے لگی کہ آپ چلے جائیں مگر میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہم اسی بحث و تکرار میں تھے کہ ابا جی نے سن لیا اور کہنے لگے کہ میں چلا جاتا ہوں اور یہ چیزیں پہنچا آتا ہوں۔"

"اور تم جھ جانے دیا۔"

"ہاں وہ کہتے تھے کہ انہیں گاؤں کی شادی دیکھے بڑا عرصہ ہو گیا ہے اس بہانے گھوم پھر آئیں گے۔"

"پھر۔"

"ہم نے انہیں نام پتہ بتایا اور وہ چلے گئے۔ خیال تھا شام کو لوٹ آئیں گے' مگر ان لوگوں نے انہیں روک لیا۔ بڑی خاطر تواضع کی اور میری بیوی بچوں کے لئے تحفے تحائف بھی بھجوائے' ابا جی دیر تک وہاں کی تفصیلات بتاتے رہے۔ پھر مجھے الگ بلا کر انہوں نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں جس کا بیاہ ہوا تھا' ایک عجیب بات بتائی۔"

"اچھا۔ وہ اس سے مل کر آئے تھے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ کہنے لگے کہ جب تمہاری والدہ کا انتقال ہوا تھا اس وقت تم تین سال کے تھے اور ان کی یہی عمر تھی جو اس لڑکی کی ہے اور یہی ناک نقشہ اور قد بت' بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔"

"پھر تم نے کیا کہا۔"

"میں کیا کہتا۔ مجھے تو وہ لڑکی پہلے ہی پراسرار معلوم ہوتی تھی۔ ابا جی نے مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال دیا جس کا حل کسی کے پاس نہ تھا۔"

"پھر تم ملے اس سے کبھی۔"

"میں نے دو تین بار کوشش کی مگر ملاقات نہ ہو سکی پھر جب ابا جی کے انتقال کی خبر کہیں سے ان لوگوں تک پہنچی تو وہ چالیسویں پر آئے۔"

"وہ بھی آئی تھی؟"

"ہاں اس کا میاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے مگر میں نے انہیں تصویر بنانے پر رضامند کر لیا۔"

"تصویر؟"

"ہاں فوٹو گراف' جو سارے جھگڑے کی بنیاد بنا۔"

''مگر تم نے تصویر کیا کرنا تھی؟''

''تم جانتے ہو یار۔۔۔۔۔۔۔میں بچپن سے ایک بڑی محرومی کا شکار ہوں جب میری والدہ کا انتقال ہوا میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے اگر کوئی بتا تا کہ فلاں عورت کی شکل تمہاری والدہ سے ذرا سی بھی ملتی ہے تو میرے دل میں اس عورت کے لئے محبت اور احترام پیدا ہو جاتا۔اس کی صورت تو بقول ابا جان کے ہو بہو وہی تھی۔

''اچھا تم نے تصویر بنالی؟''

''ہاں اور اسے بڑا کر کے فریم میں لگوا لیا۔کچھ دن تو فرزانہ خاموش رہی پھر اس نے تصویر غائب کر دی۔''

''ٹھیک کیا انہوں نے آخر بیوی ہیں کیسے برداشت کر لیتیں کہ ایک غیر اور جوان عورت کی تصویر گھر میں ہو؟''

''یار حد کرتے ہو تم بھی اسی کی طرف داری کرنے لگے وہ غیر عورت کی نہیں میری مرحومہ ماں۔''

''تم سے دس بارہ سال چھوٹی ہو گی۔''

''ہاں چھوٹی تو ہے۔''

''پھر تم اسے ماں کیسے سمجھ سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں سمجھ سکتا۔میں اگر سو سال کا بھی ہو جاؤں وہ تو جوان ہی رہیں گی' انہوں نے بڑھاپا تو دیکھا ہی نہیں تھا۔''

''یار کیوں مجھے کنفیوز کرتے ہو۔تصویر بہر حال ان کی تو نہیں نا۔''

''مگر میں نے تو اپنی ماں کی سمجھ رکھی ہے۔''

''کیا بچپنا ہے یار۔۔۔۔۔۔۔اتنی سی بات پر تم نے بھابی کو خفا کر کے میکے جانے دیا۔اور تم اس قدر مدر فکسیشن کا شکار کیوں ہو رہے ہو۔''

''خدا کے لئے تم۔۔۔۔۔۔اب ایڈی پس کمپلیکس پر لیکچر شروع نہ کرنا۔''

''اچھا ذرا۔۔۔۔۔۔۔زیارت تو کراؤ خاتون کی؟''

''یہ دیکھو۔۔۔۔۔۔اور خود ہی فیصلہ کرو کیا اسے دیکھ کر کوئی برا خیال آ سکتا ہے دل میں۔''

''بھئی کمال ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''یار اسے تو میں جانتا ہوں۔''

''کیسے؟''

''یار ایسا لگتا ہے جیسے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔''

''چالیسویں پر تم یہاں تھے نہیں۔ پھر کہاں دیکھا ہوگا۔''

''ٹھہرو مجھے یاد کرنے دو۔''

''کرلو۔''

''یار میرا خیال ہے بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ پہلی بار دیکھو تو بھی لگتا ہے جیسے ہمیشہ سے جانی پہچانی ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''اور بعض عورتوں کیں ماں پن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ہر عمر میں ہر کسی کو ماں معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے تو خود یہی لگ رہا ہے۔''

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں لاؤ مجھے ٹیلی فون دو۔ میں بھابی سے بات کرتا ہوں۔''

''اس سے تو تم بات کرو۔۔۔۔۔۔۔ مگر میں تمہاری اپروچ سے مطمئن نہیں ہوں۔''



زیرو زیرو

اس واقعہ کو کئی برس ہو چکے ہیں۔

ایک روز وہ کسی دوست کو الوداع کہنے ائیر پورٹ گیا ہوا تھا کہ اس کی نظر درمیانی عمر کی ایک خاتون پر پڑی جس کا چہرہ اسے جانا پہچانا معلوم ہوا اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر الجھ سا گیا۔ مگر پھر اس کے اندر مشین سی چلنے لگی۔ نو سے ضرب ننانوے اور نو سو ننانوے سے ضرب۔ دس قطاروں ی نو پودے۔ پانچ خطوط مستقیم سے دائرے کے سولہ حصے اور اسے یاد آ گیا وہ جمیلہ تھی۔

اپنے والد کے تبادلے کے بعد کسی دوسرے شہر چلے جانے سے پہلے وہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دونوں ایک ساتھ کھیلتے اور سکول آتے جاتے تھے۔ وہ اسے حسابی کھیلوں پہیلیوں اور معموں سے پریشان کیا کرتا تھا۔ پلک جھپکنے میں لمبی لمبی ضربیں دے لیتا تو وہ منہ میں انگلیاں ڈالے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھتی رہتی۔ اسے ہندسوں کے طرح طرح کے کھیل تھے۔ پندرہ کنکریوں اور بارہ جوتوں کے کھیل۔ پانچ قطاروں میں دس پودے ہر قطار میں چادر۔ وہ اسے بڑے خوبصورت خط لکھا کرتی تھی۔ اور وہ خطوط میں ہندسوں کے معمے لکھ بھیجتا تھا جن کے صحیح جوابات جاننے کے لئے وہ بے چین ہو کر ملنے آ جاتی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر اسے تلاش کیا۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے الگ تھلگ کھڑی کسی نئی فلائیٹ کے نے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دوبارہ دیکھ کر اس کے اندر بلب سا روشن ہو گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اس نے تھوک نگل کر گلا تر کیا اور کانپتی آواز میں بڑے وثوق سے پوچھا:

"آپ جمیلہ ہیں ۔۔۔۔۔۔۔جمیلہ حق؟"

"جی ہاں" اس نے اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔"

اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بیتابی سے لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

"میرا نام کمپیوٹر ۔۔۔۔۔۔۔معاف کیجئے کریم ہے۔ عبدالکریم"

"عبدالکریم؟ اوہ نو ۔۔۔۔۔۔۔ارے سچ مچ آپ عبدالکریم ہیں۔"

"میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا۔"

''آپ اس قدر بدل گئے ہیں؟''

''بس ایسا ہی ہے۔''

پھر اس نے بہت سی باتیں پوچھیں بہت کچھ بتایا۔ وہ اپنی کسی رشتہ دار کو لینے آئی تھی۔ وہ اب اسی شہر میں آ گئی تھی۔ اور اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس رہتی تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شوہر حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ لیکن جائیداد سے معقول آمدنی تھی۔ اسے اس کے بیوہ ہو جانے کی خبر سن کر افسوس ہوا اور اس نے اس کا اظہار بھی کیا لیکن اس سے زیادہ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کے بہنوئی ایک بڑے عہدے پر فائز اور نہایت با اثر آدمی تھے۔ اگر وہ اس کے باس کو اشارتاً بھی کہہ دیں تو اس کی پروموشن فوراً ہو سکتی تھی۔ فلائیٹ آ گئی تھی۔ جمیلہ نے جلدی جلدی سے اپنا پتہ بتایا مکان نمبر 819 گلی نمبر 27 سیکٹر ایف ایٹ فور اور کسی روز گھر آنے کی دعوت دے کر چلی گئی۔ مگر اپنی یادوں کی خوشبوں چھوڑ گئی۔ جمیلہ کا پتہ کمپیوٹر میں محفوظ ہو چکا تھا۔

وہ کئی برسوں سے ایک بڑے دفتر میں ایک چھوٹی سی پوسٹ پر کام کر رہا تھا یوں کہنے کو تو اس کا ایک ہی باس تھا۔ مگر حقیقتاً دفتر کے دوسرے شعبوں کے کئی ایک انچارج بھی اس پر حکمرانی کرتے تھے۔ اس طرح کے پاس بے شمار کام جمع ہو جاتا تھا۔ مگر وہ کام سے کبھی نہیں گھبراتا تھا۔ اسے چائے ملتی رہتی تو وہ مسلسل دس دس بارہ بارہ گھنٹے روزانہ کام کر سکتا تھا۔ چائے اس کے لئے ایسی ہی ضروری تھی جیسے انجن کے لئے پٹرول یا تیل اس کی اس کمزوری سے دفتر کے سب لوگ آگاہ تھے۔ چنانچہ اس کے دوسرے ساتھی بھی چائے کے عوض سے اپنا کام دے جاتے تھے۔

اس نے ریاضی کے ساتھ گریجوایشن کی تھی لیکن اگر اس کے پاس یہ ڈگری نہ بھی ہوتی تو بھی اعداد و شمار سے اس کی دلچسپی کم نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔ اسے بچپن ہی سے ریاضی الجبرا اور اعداد و شمار پر مبنی مضامین سے گہرا شغف تھا۔ فارغ اوقات میں وہ رسالہ اخبار پڑھنے یا فلم دیکھنے کی بجائے کوئی مشکل سوال لے کر بیٹھ جاتا۔ ریاضی کے دقیق مسائل حل کر کے اسے اتنی ہی ذہنی آسودگی ملتی جتنی شاعر کو اچھی غزل کہنے مصور کو تصویر بنانے میں مل سکتی ہے۔ اسے اعداد و شمار سے متعلق دنیا بھر کی بجھارتیں اور معمے یاد تھے اس کا دعویٰ تھا اس نے آج تک ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کئے بغیر نہیں چھوڑا تھا مشکل سے مشکل سوال کو وہ منٹوں میں حل کر لیتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی سوال میں الجھ جاتا تو اس وقت تک کھانا نہ کھاتا (صرف چائے پیتا رہتا) جب تک اسے حل نہ کر لیتا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اسے کھیلوں جلسوں، جلوسوں اور دوسری تفریحات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اسے کوئی پارٹنر مل جاتا تو وہ حسابی کھیلوں سے دل بہلاتا اور دوسروں کو پریشان کرتا رہتا۔ ریاضی میں اس کی قابلیت ہر جگہ مسلمہ تھی۔ اگر فائنل ایئر میں وہ بیمار نہ پڑ جاتا تو شاید بڑی اچھی

ڈویژن حاصل کرتا۔ اس کا ارادہ شماریات یا ریاضی میں ایم اے کرنے کا تھا۔ مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے اسے ملازمت کرنا پڑی۔

ملازمت ملنے سے پہلے وہ کچھ عرصہ بیکار رہا تھا۔ دن بھر مختلف دفتروں اور اداروں کے چکر لگاتا درخواستیں لکھتا اور بھیجتا رہا۔ پھر جب اسے معقول ملازمت ملنے کے امکانات کم نظر آئے تو اس نے دفتر میں ایک معمولی سے اسٹی مٹر و کی پیش کش قبول کر لی' ملازمت چونکہ اس کے مزاج کے مطابق اور اعداد و شمار سے متعلق تھی اس لئے وہ مطمئن بھی تھا۔ اس کے فرائض میں دیے ہوئے نقشوں اور پیمائشوں سے عمارتوں' سڑکوں' نالیوں اور پائپ لائنوں کی مقداریں اور رقبے نکالنا اور شیڈول آف ریٹس کے مطابق نرخ لگا کر اخراجات کا تخمینہ لگانا تھا۔ یا پھر ذیلی دفتروں سے آئے ہوئے ایسے ہی تخمینوں کی جانچ پڑتال کرنا۔ انجینئرنگ کی بعض اصطلاحات سے وہ شروع شروع میں ناواقف تھا۔ مگر ہندسے جہاں اور جیسے بھی ہوں اس کے لئے کوئی اجنبیت نہیں رکھتے تھے۔۔ اس لئے جلد ہی وہ ایک باکمال اسٹی میٹر کے طور پر پہچانا جانے لگا۔

اس کی ریاضی دانی اور حساب کتاب سے دلچسپی کے پیش نظر چیف کاؤنٹنٹ بھی اس سے مدد لینے لگا وہ کینٹین کے لڑکے کو دو چائے کا آرڈر دیتا اور چار سو ضربوں اور تقسیموں کا کام اس کے سامنے رکھ جاتا۔ سرکل ہیڈ ڈرافٹسمین اس سے بے تکلف ہوا تو ڈرائنگ برانچ کا کیلکولیشن ورک بھی اس کے حصے میں آ گیا۔ اس کے علاوہ بڑے دفتر کے کوانٹٹی سرویئر اور ملحقہ دفتروں کے چھوٹے بڑے انجینئرز بھی اکثر اسے بیگار میں پکڑے رکھتے اور چائے اور سموسوں کے بدلے تین دن کا کام ایک ہی دن میں کرا کر چلتے بنتے۔

اس کا باس اس کے کام سے بڑا خوش اور مطمئن تھا۔ اس کے کام میں غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ضربوں اور تقسیموں کی ایک ایسی مشین تھا جو کبھی خراب ہوتی تھی نہ تھکتی تھی۔ اور کئی کئی روز کا کام چند گھنٹوں میں مکمل کر دیتی تھی۔

پھر دفتر میں اس کی مدد کے لئے کیلکولیشن مشین آ گئی۔ لیکن اکاؤنٹنٹ نے اس پر یہ کہہ کر قبضہ کر لیا کہ اسٹی میٹر صاحب تو خود کمپیوٹر ہیں انہیں ایسی معمولی مشین کی کیا ضرورت ہے۔ اکاؤنٹنٹ کی یہ بات یار لوگوں کو اتنی پسند آئی اور شائد اسے بھی کہ اسے کمپیوٹر کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس نے کمپیوٹر نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ اس میں اور کمپیوٹر میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

جب اکاؤنٹس برانچ کے عملے کو کیلکولیٹر پر کام کرنے کی اچھی مشق اور مہارت ہوگئی تو دفتر میں اکثر کیلکولیشن ورک کے مقابلے ہونے لگے۔ مرکب اعداد' کسور اور جذر وغیرہ کی رکاوٹوں کی وجہ سے اکاؤنٹنٹ ہار جاتا۔ اور وہ شرط جیت کر خود بھی ان سے چائے پیتا اور دوسروں کو بھی پلواتا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی حقیر خوشیوں کے سہارے اس نے بہت سے سال گزار دیے۔

آٹھ برس گزر گئے۔

دفتر میں کئی ایک لوگ نئے آگئے کئی ایک ترقی پا کر ریٹائر ہو کر چلے گئے اس کے باس بھی بدلتے رہے۔ مگر اس کے کام کی نوعیت اور رفتار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان آٹھ برس میں اس نے بہت سے دوسرے محکموں میں بہت ملازمت کے لے درخواستیں بھجوائیں۔ انٹرویوز دیئے، مگر سفارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ کہیں بھی بہتر ملازمت حاصل نہ کر سکا۔ یوں بھی وہ اپنی آٹھ سالہ ملازمت آسانی سے نہ چھوڑ سکتا تھا۔ تنخواہ میں سالانہ ترقیوں کی وجہ سے تھوڑا بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اسے کوانٹٹی سرویئر کے عہدے پر ترقی پانے کی قوی امید تھی۔ لیکن یہ بات صرف اس کا باس اور دفتر کا سپرنٹنڈنٹ جانتے تھے کہ وہ کبھی ترقی نہیں پا سکے گا کیوں کہ وہ اس جیسے باکمال اسٹی میٹر سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

وقت کے ہندسے سے ضربیں کھاتے اور جمع ہوتے رہے۔

اس کے بچے تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں پہنچ گئے۔ اس کی چھوٹی بہنیں جوان ہو گئیں۔ اور اس کی کنپٹیوں پر سفید بال گنتی کی حد سے بڑھنے لگے۔

والدہ اور بیوی کے زیورات تو پہلے ہی بک چکے تھے۔ ایک مکان رہ گیا تھا' آخر اسے گروی رکھ کر اس نے بہنوں کی شادیاں کیں مگر جب وہ انہیں رخصت کر چکا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کا دماغ بھی جہیز میں اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ اس سے دفتر کے کام میں اکثر چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہونے لگیں۔ لیکن دفتر کا عملہ اس پر قدر اعتماد کرتا تھا کہ اس کی غلطیاں پکڑے جانے کی نوبت کبھی نہ آئی۔

انہی دنوں اس کے دو ایک دوست پروموٹ ہو گئے اس نے ان سے اس خوشی میں چائے بھی پی اور مٹھائی بھی کھائی لیکن اسے چائے میں مزہ آیا نہ مٹھائی میں۔ اس روز وہ اپنی سروس کے پندرہ سالوں کے مہینے ہفتے دن اور گھنٹے شمار کرتا رہا اور اسے رات بھر نیند نہ آئی۔ اس کے بعد اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر اس کے کام میں غلطیوں کی تعداد بڑھنے لگی انہیں دنوں اسے ایک عجیب سی لت پڑ گئی تھی: وہ دفتر سے آتے جاتے اور بازار میں سودا سلف خریدتے ہوئے آتی جاتی بسوں' کاروں اور سکوٹروں کی نمبر پلیٹیں پڑھتا رہتا۔ نمبر پلیٹیں پڑھنا تو کوئی ایسی عجیب بات نہ تھی۔ مگر نمبر پلیٹوں کے اعداد کو باہم جمع کرنا نہایت خطرناک تھا۔ اس نے کئی بار مصمم ارادہ کیا کہ وہ کسی گاڑی کی نمبر پلیٹ کی طرف دھیان نہیں دے گا۔ مگر جونہی کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیتا یا بریک لگنے کی آواز سنائی دیتی اس کے اندر کی مشین کا سوئچ آن ہو جاتا آر آئی اے فائیو نائن ڈبل فور۔ فائیو پلس نائن پلس فور پلس فور از ایکول ٹو ٹوئنٹی ٹو۔

مشین چلتی رہتی۔اور ٹو نٹی ٹو کے دونوں ہندسے پھر سے جمع ہوتے ٹو پلس ٹو از ایکوئیل ٹو فور۔

یہ سب کچھ لمحہ بھر میں خود بخود ہو جاتا اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ کب اور کیسے اس نے نمبر پلیٹ کے ہندسوں کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کوئی دوسری گاڑی آ جاتی اور اس کا ذہن مصروف ہو جاتا۔

دفتر کے کام میں غلطیاں پکڑی جانے لگیں اور پہلے نرم اور پھر گرم لہجے میں اس سے باز پرس ہونے لگی تو ہندسوں اور عددوں کو جمع کرنے کی عادت اور بھی پختہ ہو گئی اسے کوئی نمبر پلیٹ نظر نہ بھی آتی تو وہ خود ہی اعداد فرض کر لیتا اور ان کو جمع کرتا۔ضربیں دیتا رہتا۔ دل ہی دل میں فرضی اعداد کے عادِ اعظم اور جزر نکالتا رہتا۔مکان نمبر ہو یا ٹیلیفون نمبر وہ ہندسوں کع جمع کرنے یا ان کے ذواضعاف اقل نکالنے پر خود کو مجبور پاتا۔

بچوں کی تعلیم کے اخراجات' چائے کا بل' گھر کا خرچ' قرضے کی قسطیں' مہنگائی اور بیوی سے لڑائی جھگڑا!

ان سب سے بچنے کے لئے وہ ہندسوں کے جنگل میں پناہ لیتا۔ہندسوں کے علاوہ اس کا کسی بات پر اختیار نہیں تھا۔ہندسے ہی اس کے مونس وغم خوار تھے معصوم اور وفادار ہندسے وہ چاہتا تو انہیں جمع کر دیتا چاہتا تو ان کو ضرب دے دیتا' ہندسوں نے کبھی شکایت نہ کی تھی۔دفتر میں اس نے اپنے پلے سے چائے پینا کم کر دی تھی۔وہ دوسرے لوگوں کو چائے کے لئے پھانستا اور اس کے بدلے ان کا دیا ہوا ڈھیروں کام دفتر بند ہو جانے کے بعد بھی کرتا رہتا۔

اس نے چند ایک بار اپنی ترقی کے لئے اپیل بھی کی مگر باس نے بلا کر اس کی توجہ کام غلطیوں کی طرف دلائی اور ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا۔مگر اب جمیلہ سے اچانک ملاقات کے بعد اسے امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔اس کے بہنوئی کے بااثر ہونے اور اس کے اختیارات کا اندازہ لگانے کے بعد اس کے دل میں ہری ہری کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے اندر کمپیوٹر کو زنگ لگ چکا تھا اور اب اس کی اوور ہالنگ ہو رہی تھی۔جمیلہ اب بھی خوبصورت تھی۔اور شاید اب بھی اسے چاہتی تھی یقیناً وہ اس کی دکھ بھری روداد سن کر اس کی مدد کرے گی اور اس کی برسوں سے رکی ہوئی ترقی ہو جائے گی۔ترقی سے تنخواہ میں اضافہ کے خیال سے اسے خوشگوار خیالوں نے آ گھیرا اور وہ طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے منصوبے بنانے لگا۔

اس نے کئی روز تک جمیلہ کیہاں جانے کی تیاری کی اور ایک چھٹی کے روز شیو بنا کر نہا دھو کر اور اجلے کپڑے پہن کر اسے ملنے کے لئے گھر سے روانہ ہوا۔

بچپن کی حسین یادوں اور جمیلہ کی دلنشین مسکراہٹوں کے تصور سے اس کے دل میں محبت اور چاہت کے بگولے اٹھنے لگے اور وہ

ان کے ساتھ اڑتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ بالکل بھول گیا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے بہت سے بچے ہیں۔ اس کا آدھا سر سفید ہو گیا اور وہ جمیلہ کے ہاں اپنی محکمانہ ترقی کے سلسلے میں سفارش کے لئے جا رہا ہے' اسے صرف اتنا یاد تھا۔ جمیلہ اب بھی نہایت حسین تھی اور بیس برسوں کے بعد بھی وہ اسے محبت اور اپنائیت سے ملی تھی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد جب بگولوں کی گرد چھٹی اور جذبات کے جھکڑوں سے باہر آیا تو اسے یہ سوچ کر دھچکا سا لگا کہ وہ جمیلہ کے ہاں ملازمت میں ترقی کے سلسلے میں جا رہا ہے اس کو اپنے آپ سے گھن سی آئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اور پریشانی سے بچنے کے لئے اس نے حسب معمول ہندسوں کی جمع تفریق شروع کر دی۔ ویگن سے اتر کر سیکٹر ایف 8 فور کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر مکان نمبر 819 پہلے اور گلی نمبر 27 بعد میں لکھا جائے تو عدد 81927 بنتا ہے اور اگر اس کے برعکس گلی نمبر پہلے اور مکان نمبر بعد میں لکھا جائے تو عدد 27891 بنتا ہے پھر نجانے کیوں اس نے ان دونوں کسروں کا فرق 54108 نکال لیا۔ لیکن پھر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس حاصل رفریق کا کیا کرے۔ اس نے ذہن پر بہت زور دیا۔ مگر اسے بالکل یاد نہ آیا کہ 45108 روپے تھے۔ ٹیلیفون نمبر تھا۔ یا کسی کے گھر کا پتہ اور اس کا کیا کرنا تھا۔ شاید سب کچھ زیروزبر ہو چکا تھا۔

اس واقعہ کو کئی برس گزر چکے ہیں۔

وہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہے۔ اس کے دو بڑے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اسے بہت کچھ یاد ہے۔ لیکن اسے جمیلہ کے گھر کا پتہ بھول گیا ہے۔ فارغ اوقات میں وہ لیٹ کر پہروں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن اسے یاد نہیں آتا۔



ببول سے لپٹی ہوئی بیل

بس روانہ ہوئی تو میں نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

پکی سڑک بن جانے کی وجہ سے راستہ بدلا ہوا ضرور نظر آتا تھا مگر سڑک سے ہٹ کر وہی میرے دیکھے بھالے کھیت اور درخت تھے۔ البتہ بعض چھوٹے درخت بڑھ کر تناور پیڑ بن گئے تھے اور بعض تناور پیڑ بوڑھے اور ٹنڈ منڈ ہو گئے تھے۔ میرے ذہن میں یادوں کی فلم سی چلنے لگی۔

یہ بیریوں کا جھنڈ ہے جہاں ہم سالانہ امتحانوں کے بعد بیر کھانے آیا کرتے تھے۔ یہ سیم نالہ ہے جہاں ہم مچھلیاں پکڑتے تھے۔ یہ نہر کا پل ہے جہاں حسینوں جلاہے سے میری لڑائی ہوگئی تھی اور اس نے تختی مار کر مجھے زخمی کر دیا تھا۔ یہ سائیں نظام دین کا مزار ہے یہاں میں نے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان کے لئے منت مانی تھی۔ بچپن کے ساتھی ان کی باتیں' شرارتیں' باہمی لڑائیاں اور محبتیں' ماں باپ کی شفقتیں' ماسٹر شاہنواز کی جھڑکیاں' خرگوشوں کا شکار' کبڈی کے اکھاڑے اور تاجی۔

اس کا زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور ویرانوں میں گزرتا تھا ان کے اپنے کھیت تھے نہ کوئی کمانے والا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چنتی رہتیں۔ اپنی بکری کے لئے ٹہنیاں اور چارہ اکٹھا کرتی رہتیں۔ کسان فصلیں اٹھا کر لے جاتے تو وہ کھیتوں میں گرے پڑے گندم یا دھان کے خوشے چنتی رہتیں۔ کبھی لانی کی جھاڑیاں کاٹنے نہر پار والے کلر میں چلی جاتیں۔ ان جھاڑیوں کی راکھ سے وہ کپڑے دھونے کے صابن کا کام لیتیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو کئی بار اس کی ماں کے منع کرنے کے باوجود میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ اس کی ماں عجیب وغریب قسم کی چیزیں جمع کرتی رہتی۔ ساگ پات کی گٹھڑی سی باندھ لاتی۔ پوہلی کو جھاڑ کر اس کے بیج نکالتی جسے وہ بھٹی میں بھون کر مزے سے کھاتیں۔ کبھی گاؤں میں کوئی جانور ذبح کیا جاتا تو وہ اوجھڑی' آنتیں اور پھیپھڑے اٹھا لاتیں۔ بیروں' جنگلی شہتوتوں' تالابوں میں اگی کمیوں اور آندھی سے گرے کچے پکے آموں کے لئے کئی کئی کوس کا سفر کرتیں۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران ایک بار میرا پاؤں کانٹا لگنے سے زخمی ہو گیا تھا تو وہ پریشان ہو گئی تھی اور اس نے کہا تھا۔

''تو اس گرمی میں ہمارے ساتھ کیوں پھرتا ہے تیرا باپ تو زندہ ہے اور پٹواری ہے۔''

مجھے یاد آیا ماں بیٹی دونوں بہت خود دار تھیں کسی کی مدد قبول نہیں کرتی تھیں۔ کپاس چن کر اور اجرت پر سوت کات کات کر وقت

گزارتی تھیں۔ میں کئی بار گھر سے کھانے پینے کی کوئی چیز یا پھل فروٹ چاٹ لے کر گیا اور انہوں نے واپس کر دیا۔ البتہ اس نے میرے میٹرک میں پاس ہونے کے موقع پر مٹھائی کا ڈبہ نہایت خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''تمہاری کامیابی میں میری دعائیں بھی شامل ہیں۔''

جن دنوں میں بی اے میں تھا اور کبھی کبھار گاؤں آتا تھا۔ تاجی مجھ سے میاں محمد سیف الملکوک پڑھنے آجاتی تھی۔ ایک روز کہنے لگی:

''ذرا اس شعر کی وہ تو کرو۔ کیا کہتے ہو تم؟''

''تشریح۔''

''ہاں وہی۔''

''کون سا شعر ہے۔''

''ہسن کھیڈن نال لے گیوں پاگیوں ڈوہنگھے فکراں
پائی لیر پرانی وانگوں ٹنگ گیوں وچ ککراں''

''اس میں کیا مشکل ہے؟''

''مشکل تو نہیں مگر تم تشریح اچھی کرتے ہو۔''

''اچھا سنو۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ بدیع الجمال پری بہت خوبصورت تھی تمہاری طرح۔''

''ہاں۔'' وہ شوخی سے بولی ''میری پھوپھی جو لگتی تھی۔''

''جب اس کا محبوب شہزادہ اس سے بچھڑ جاتا ہے۔''

''تمہاری طرح۔'' اس نے لقمہ دیا۔

''بیچ میں مت بولو۔ میں نے کسی معمر استاد کی طرح ڈانٹ کر کہا'' تو بدیع الجمال اسے یاد کر کے کہتی ہے کہ تمہاری فرقت میں میرا کھانا پینا ہنسنا بولنا جھوٹ گیا ہے تم مجھے گہرے غموں کے حوالے کر گئے ہو اب میری حالت اس دھجی کی سی ہے جسے جاتے وقت تم نشانی کے طور پر ببول کی کسی ٹہنی پر لٹکا گئے تھے۔

میں چونک پڑا وہ رو رہی تھی۔ میں نے سبب پوچھا تو گلوگیر آواز میں بولی: ''مجھے پتہ ہے تم بھی ایک دن مجھے اسی طرح کانٹوں میں الجھا چھوڑ جاؤ گے۔''

''مجھے یاد آرہا تھا۔''

''میں شعر پڑھتا وہ دہراتی جاتی مگر جس طرح ہر مصرع اس کی آنکھوں میں تحلیل ہو کر ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اسے لفظوں کے ذریعے کسی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں اور اس کی پلکیں جھپکنے ابرو سکیڑنے اور آنکھیں میچنے کے سیکڑوں انداز تھے۔ جب اس کی سیاہ روشن آنکھیں پوری طرح وا ہوتیں لگتا آدمی ڈوب کر اب کبھی نہ ابھرے گا پھر وہ کسی مصرعے پر آنکھوں کو تھوڑا سا بند کر لیتی تو شکنجے میں کسے جانے کا احساس ہوتا۔ ایک بار میرے عقب سے دھوپ کی ایک کرن آ کر اس کے چہرے پر پڑنے لگی اس نے دھوپ سے بچنے کے لئے آنکھیں نیم وا کر کے میری طرف دیکھا اور میرا دم نکل گیا۔ یاد آیا ان دنوں وہ سارے گاؤں کے دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ جس کو جو حکم دے دیتی فوری تعمیل ہوتی پھر اس کے بہت سے امیدوار اور رشتہ دار پیدا ہو گئے۔ مراد ان میں سے ایک تھا۔ اس کی ماں کے بھڑکانے پر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر غیر ذات کے پٹواری کے لڑکے کی خاطر وہ اس سے بیاہ نہیں کرے گی تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا۔ مراد جیسے اجڈ اور خونخوار آدمی ایسا اقدام کچھ بعید نہ تھا اس خیال سے کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچے وہ مجبور ہو گئی تھی۔

ایک جگہ بس جھٹکے کے ساتھ رکی تو میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ روبی میگزین پڑھ رہی تھی مگر فوزیہ بڑے انہماک سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک تھی۔ شاید اسے بھی اپنا بچپن اور بچھڑے ہوئے لوگ یاد آ رہے تھے۔ میں نے اس کے دل میں ہمدردی کے گہرے جذبات محسوس کئے مگر دوسرے ہی لمحے تاجی نے پھر مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پچھلے دنوں ہمارے وطن لوٹنے پر گاؤں سے میری پھوپھی زاد آپا ہمیں ملنے آئی تھیں اور انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ تاجی کے بارے میں بھی بہت سی معلومات فراہم کی تھیں اور جہاں یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ اب بھی میرے بمیر ے بارے میں پوچھتی اور یاد کرتی تھی وہاں مجھے یہ سن کر دکھ ہوا تھا کہ شادی کے چند سال بعد ہی وہ بھی اپنی ماں کی طرح بیوہ ہو گئی تھی اور اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر اپنی ماں کے پاس آ گئی تھی آپا نے یہ بھی بتایا تھا کہ شوہر کی بے وقت موت سے اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا مگر محنت مزدوری اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس نے ہمت نہیں ہاری نہ کسی کے آگے دست سوال دراز کیا۔ مگر عسرت کی زندگی، دن رات کی محنت و مشقت اور غم کی گہری دھوپ نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

مجھے یاد آیا۔۔۔۔۔۔ میں اس کی یاد کو دل کے ٹیپ سے کبھی ایریز نہیں کر سکا تھا۔ مجھے اکثر اداسی کے دورے سے پڑا کرتے تھے۔ فوزیہ منہ سے تو کچھ نہ کہتی تھی مگر جب کبھی میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتا وہ زیادہ توجہ دینے لگتی۔۔۔۔۔۔ مگر پیندے میں سوراخ

ہوتو آپ گھڑے کو کتنا ہی بھر بھر کر رکھیں' ضرورت کے وقت خالی ہی ملتا ہے۔ بظاہر مجھے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ فوزیہ حسین اور تعلیم یافتہ تھی اور مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ چاندی بیٹی' معقول آمدنی اور خوبصورت گھر۔ مگر مجھے ہمیشہ کسی انجانی چیز کی کمی کا احساس رہتا تھا لگتا تھا جیسے میرا دل خوشی کے سچے ذائقے سے خالی ہو۔۔۔۔۔۔۔ عام حالات میں میں اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا مگر جب کبھی علالت کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی تو دکھوں کے سنپولیئے اندر کے بلوں سے جھانکنے لگتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے سردی لگ کر بخار آ گیا تھا۔ ڈاکٹر دوائی اور تسلی دے کر چلا گیا تھا مگر نصف شب کے قریب بخار تیز ہو گیا۔ فوزیہ تھوڑی دیر بعد آ کر میری مزاج پرسی کرتی اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے دوا پلاتی رہی۔ پھر مجھے نیند سی آ گئی اور میں عجیب وغریب خواب دیکھنے لگ گیا۔

ایک بہت ہی باریک سا نقطہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جاتا اتنا بڑا کہ ہر طرف پھیل جاتا اور میں اس کے بوجھ تلے کراہنے لگتا۔ پھر وہ سکڑنا شروع کر دیتا سکڑتے سکڑتے اس قدر چھوٹا ہو جاتا کہ میرا دم گھٹنے لگتا۔ پھر مجھے عجیب وغریب شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ سینگوں والا گھوڑا' دمکٹی چھپکلیاں' دومونہے سانپ' گردن کے بغیر موٹر سائیکل چلاتا آدمی اور الاؤ کے گرد بڑے بڑے پر پھیلا کر آگ تاپتی چمگادڑیں۔ پھر ایک بڑی سی مکھی میرے پیچھے لگ گئی میں جتنا تیز بھاگتا وہ میرے پیچھے لپکتی آتی پھر وہ عورت کا روپ دھار کر ہنسنے لگی۔

اس رات میں نے ماں کو کفن پہنے اپنے سے بغل گیر ہوتے دیکھا۔ پھر مٹی میں لت پت ذکیہ دکھائی دی۔

''ذکیہ تم؟''

''ہاں بھیا میں مری نہیں تھی ان لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے دفن کر دیا تھا۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔ میری پیاری ذکیہ۔ میری جان۔ تمہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی قبر میں۔''

''بھیا تاجی کہاں ہے۔''

''تاجی!''

''کیا آپ تاجی کو بھول گئے بھیا۔''

پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ فوزیہ میرے سرہانے بیٹھی تھی اور خاصی متفکر تھی بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ مجھے 102 بخار تھا۔ اور اس نے ایمبولینس کے لئے ٹیلی فون کر دیا تھا۔

ٹھیک ہو جانے کے بعد میں نے اپنے ایک ہم وطن اور دوست ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے مجھے دوائی کے علاوہ مشورہ دیا کہ میں وطن واپس جاؤں اور کچھ عرصہ وہاں رہ کر پرانے لوگوں' رشتہ داروں اور دوستوں سے ملوں اور ان جگہوں کو دیکھوں جن کے عرصہ تک نہ دیکھنے کی وجہ سے میرا دل خوشی سے خالی ہو گیا تھا۔ میرا اپنا دل بھی وطن جانے کو چاہ رہا تھا۔ چنانچہ ہم ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ گئے۔ مگر ہمارا بہت سا وقت شہر میں چھوٹے بھائی کے ہاں گزر گیا۔ دوسرے بہت سے رشتہ دار اور ملنے والے بھی وہیں تھے۔

بس رکی تو میں چونک پڑا۔ سامنے میرا گاؤں تھا۔

میں نے آپا کو خط لکھ کر آنے کی اطلاع دی تھی اس کا میاں اور بچے گاؤں کے بس اسٹاپ پر ہمارے منتظر تھے۔ گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی استقبال کے لئے موجود تھے۔

ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے کھوئی ہوئی کوئی چیز مل گئی ہو۔ گلیوں میں آتے جاتے مردوں سے علیک سلیک کرتا اور دروازوں پر کھڑی ماسیوں' پھوپھیوں اور چچیوں کو سلام کرتا اور دعائیں لیتا میں آپ کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا تاجی بھی اپنے گھر کے دروازے پر ضرور نظر آئے گی۔ پتہ نہیں وہ کیسی ہو گی۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد مجھے دیکھ کر اس کے جذبات کیا ہوں گے اور وہ کس طرح پیش آئے گی۔ میرا دل اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہو گیا تھا لیکن اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ شاید اسے میرے آنے کی خبر نہیں تھی یا اس کی ماں نے منع کر دیا تھا۔ میرا دل بجھ سا گیا۔

آپا کے گھر کا دالان اور منڈیریں گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں سے بھر گئیں۔ وہ فوزیہ کے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں میں بہت دلچسپی لے رہی تھیں۔ آپا بہت مصروف ہو گئی تھیں۔ جتنے لوگ جاتے اتنے اور آ جاتے تھے۔ رات گئے تک ملنے ملانے والے لوگوں' بچپن کے دوستوں اور ہم جماعتوں کا تانتا بندھا رہا۔ مگر مجھے جس کا خاص طور پر انتظار تھا اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔

تاجی اگلے روز بھی نہیں آئی۔ اس دوران میں میں نائیوں کے گھر تعزیت کے بہانے آتے جاتے اس کے گھر کے سامنے سے بھی گزرا مگر دروازہ بند تھا۔ جی چاہا دستک دوں مگر یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کے بچے جوان ہوں گے۔ پتہ نہیں ان کا رویہ کیسا ہو اور وہ کیا سوچیں۔

اگلے روز ہمیں واپس آنا تھا۔ تاجی اب تک نہیں آئی تھی۔ شاید وہ مجھ سے ناراض تھی یا وہ فوزیہ سے ملنا نہیں چاہتی تھی' مگر کیوں؟ آپا نے تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجھے یاد کرتی اور میرے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ کیا پتہ اس کی ماں نے منع کر دیا ہو بڑھیا اب تک مجھ

سے خفا ہو گی۔

جب تم رخصت ہو رہے تھے اچانک خلاف توقع تاجی کی ماں آ گئی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تاجی کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی راہ ہموار ہوتی نظر آئی۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا:

''سلام خالہ''

جواب میں اس نے مجھے سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے دیکھا اور روتی ہوئی واپس چلی گئی۔



بیتال کتھا

بیتال بولا: تم کون ہو اور مجھے کہاں لئے جاتے ہو!

راجا کہنے لگا: میرا نام راجا ہے اور میں تجھے اپنی ماں پرجارانی کے پاس لئے چلتا ہوں۔

"اتنی بات راجہ کے منہ سے سن کر بیتال کھلکھلا کر ہنسا اور واپس جا کر اسی درخت پر لیٹ گیا جہاں سے راجا اسے جان پر کھیل کر اتنی مشکلوں سے لایا تھا۔

راجا دیکھے تو بیتال نہیں ہے۔ بہت پریشان ہوا۔ ساری محنت اکارت جاتی معلوم ہوئی۔ دوبارہ آسیب زدہ باغ میں جانے کا سوچ کر ہول آنے لگا جہاں قدم قدم پر خوفناک آنکھیں اور پر اسرار آوازیں راستہ روکتی اور چھلاوے کی طرح طرح کی ڈراؤنی شکلیں بنا کر ڈراتے دھمکاتے تھے۔ اسے وہ آندھی یاد آئی جس کے ساتھ پتھروں کی بارش ہوتی تھی اور جس کی دہشت سے پتا پانی ہوتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر پھر راجا کو اپنی بوڑھی اور نابینا ماں کی یاد آئی جس نے عمر کا اتنا حصہ اپنے باغ اور محل میں واپس جا کر آباد ہونے کی آس میں گزارا اور گھڑیاں گن گن کر اس دن کا انتظار کیا تھا۔ اور راجا ارادہ باندھ' تلوار سونت دوبارہ اس مردار کے پیچھے روانہ ہوا۔

پچھلی بار جب راجا باغ میں داخل ہوا تھا' ہر چیز کالے رنگ کی آندھی اور گرد و غبار میں چھپ گئی تھی۔ مگر اب آندھی سرخ تھی اور ہر چیز لہولہان نظر آتی تھی۔ راجا ایک لمحے کو ٹھٹھکا مگر پھر سنبھل کر چلنے لگا۔ تب چاروں اور اسے طرح طرح کی عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔ ان کو وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ مگر اس وقت یہ اتنی بلند' خوفناک اور ڈراؤنی نہ تھیں۔ شاید ان کم ذاتوں کو تب راجا کے پختہ ارادے کا پورا اندازہ نہیں تھا۔ مگر اب وہ اپنے تمام حربے آزما رہے تھے۔ ہر قدم پر کتے غراتے بلیاں لڑتیں بھینسیں ڈکراتیں اور ہاتھی چنگھاڑتے۔ چوہے اور نیولے دوڑتے۔ بچھو ڈنگ لہراتے' سانپ پھنکارتے اور سرسراتے۔ مگر راجہ نے ہمت نہ ہاری = اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر پرجا محل اور باغ کو جسے اس کے باپ دادا نے کمال خوبی سے تعمیر کیا تھا اور جس پر چنڈالوں نے قبضہ کر کے اسے اور اس کی ماں پرجارانی کو بے دخل کر دیا تھا' آزاد کرا کر دم لے گا۔ تب اسی بچے کی جو پچھلی بار ہنس ہنس کے بے حال ہوتا تھا جیسے اسے گدگدایا جا رہا ہو رونے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ چیخنے اور چلانے لگا جیسے کوئی خوفناک بھیڑیا اسے جھنجھوڑنے لگا ہو۔

ایک بار تو راجا کا دل دہل گیا۔ مگر اس نے اوسان خطا نہیں ہونے دیئے۔ تب بہت سے لوگوں کے سسکنے' کراہنے' چیخنے اور تڑپ تڑپ کر جان دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مانو کسی کا گلہ گھونٹا جارہا ہو' کسی کو ذبح کیا جارہا ہو' کسی کو چابکوں سے پیٹا اور ان کے اعضا کاٹے جارہے ہوں۔ راجا نے سب سنا پر دل نہ چھوڑا۔ تلوار سے راستہ بناتا' پاؤں کو لپٹ لپٹ جاتے سانپوں سے چھڑاتا۔ اور قدم قدم پر بھیڑیوں کی صورت دانت نکوستے چنڈالوں کو پھلانگتا آگے بڑھتا گیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ محل کے سامنے والے اسی درخت پر وہ خبیث پہلے کی طرح رسی سے بندھا الٹا لٹکا ہے۔ تب چاروں طرف شور مچ گیا۔ لینا پکڑنا جانے نہ پائے پھر بھی اونچی آواز میں رونے لگے۔ خوفناک اور مکروہ صورت ڈائنیں' چڑیلیں' اور پچھل پیریاں سینہ کوبی کرنے لگیں۔ مگر راجہ نے اپنا دھیان نہ بٹنے دیا۔ اور آگے بڑھ کر تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ رسی کٹ گئی اور مردہ نیچے گر پڑا اور اسی پہلے کی طرح اٹھ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ راجا نے جلدی سے چادر بچھا اس اسے لپیٹ کندھے پر رکھا اور لے چلا۔

تب بیتال بولا:

''راجا تم بار بار کیوں کھچل کرتے ہو' اس محنت کا کچھ فائدہ نہیں میرا جب ار جس وقت جی چاہے گا' واپس آ جاؤں گا اور اس درخت پر لٹک جاؤں گا۔''

راجا نے جواب دیاں میں اس محل اور باغ کا وارث' پرجا رانی کا بیٹا ہوں تم اب تک یہاں اس لئے عیش کرتے رہے کہ پرجا رانی بوڑھی' نابینا اور کمزور تھی اور میں کمسن' مگر اب میں جوان ہو چکا ہوں۔ اور میرے بازو میں قوت ہی نہیں دل میں حوصلہ اور جرا تبھی ہے۔ اور ایسا کہا ہے کہ جو آدمی اپنی جان کی پرواہ نہیں کرے گا وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔

راجا کی بات سن کر بیتال زور سے ہنسا پھر کہنے لگا۔

اے راجا یہ محل اور باغ ہمیں بہت پسند ہے۔ ہم دو ایک بار اسے چھوڑ کر چلے بھی گئے تھے۔ مگر اس کے ہرے بھرے درخت' خوشنما پھول پودے اور ہریالی' خوبصورت حوض۔ عالیشان بارہ دریاں اور منقش بادم و در ہمیں بہت یاد آتے۔ اور ہمارا کھنڈروں' غاروں اور قبرستانوں میں جی اوبھنے لگتا۔ اور ہم واپس آ گئے اور اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیشہ ادھر ہی پڑے رہیں گے۔

راجا نے کہا بے شک یہ محل اور باغ عالیشان اور خوبصورت تھا۔ مگر تم بد بختوں نے اس کی کیا حالت بنادی ہے۔ در و دیوار اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نہروں اور حوضوں کے پانی پر کائی جمی ہے۔ جھاڑ جھنکار نے خوبصورت روشوں چھپا دیا ہے۔ جیتے جاگتے اور زندگی سے بھرپور باغ اور محل کو تم بدذاتو نے قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے۔ مگر اب تمہیں یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔

بیتال بولا: راجا تم بہت نادان ہو۔ تمہیں ہماری طاقت اور حربوں کا اندازہ نہیں ہے۔ جو ہم خود نہ جانا چاہیں گے تو پرجا کے تم جیسے لاکھوں کروڑوں بیٹے بھی ہمیں یہاں سے نہیں بھگا سکتے۔

یہ کہہ کر بیتال پھر چلا گیا اور جا کر اسی درخت پر لٹک گیا۔

راجا بہت پریشان ہوا۔ دل میں سوچتا تھا شاید اس سے نادانی ہوگئی جو وہ اسے مضبوطی سے باندھتا تو ضرور اسے اس کے حصار سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ یہ اپنے من میں سوچ' راجا پھر خالی چادر اپنے کندے پر ڈال الٹا پھرا اور اسے درخت سے اتارا۔ اچھی طرح چادر میں لپیٹ گانٹھ لگا کاندھے پر رکھ پھر لے چلا۔

بیتال بولا: اے راجا! تم ناحق میری اور اپنی نیند خراب کرتے ہو۔ اس بیگار سے کیا حاصل۔

راجا نے کہا تجھتی بارشاہے واپس چلے جاؤ مگر میں تمہیں وہاں نہیں نکلنے دوں گا کیوں کہ میرا ایمان ہے: دل سے کوشش جاری رکھی جائے تو کامیابی ضرور ہوتی ہے۔ میں نے ماں سے عہد کیا ہے کہ اسے پھر سے اس کے محل میں لا بساؤں گا۔

بیتال بولا میں تمہاری بات اور تمہارے دھن کا پکا ہونے سے خوش ہوا۔ مگر میں ایک شرط سے چلتا ہوں۔

راجا نے پوچھا کونسی شرط!

بیتال بولا میں تمہیں کتھا سناتا ہوں۔ پر جو تم بیچ میں بول پڑے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور جو تم نے میری بات سن کر سوجھ بوجھ سے کام لیا اور اس کا حل ڈھونڈ لیا تو میں پرجا محل اور باغ سے اٹھ جاؤں گا۔

راجا نے کہا مجھے منظور ہے۔

تب بیتال بولا: اے راجا! جھناؤں نام کی ایک ندی۔ اس کے کنارے ایک چھوٹا سا نگر جس میں حسو نام کا ایک تیلی رہتا تھا۔ حسو بڑا غصیلا' خود غرض اور بدمزاج آدمی تھا بات بات پر اپنی بیوی اور بیل کو پیٹتا۔ گالیاں دیتا اور ہر کسی سے الجھ پڑتا۔ غصے بھوک اور شہوت کا غلام ۔۔۔۔۔۔۔ جب ان میں سے کسی حالت یا کیفیت میں مبتلا ہوتا۔ جو چیز قریب یا سامنے ہوتی اسے توڑ مروڑ دیتا۔ اس کی اس عادت سے سبھی لوگ واقف تھے' اس لئے اس سے کتراتے خوف کھاتے اور دور رہتے تھے جس سے حسو کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اور اس کے مزاج میں شیخی بھی شامل ہوگئی۔ وہ جس کی چاہتا پگڑی اتار دیتا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ حسو گھر سے کچھ فاصلے پر کولہو پر تھا اور اسے سخت بھوک لگی تھی۔ جب ڈری سہمی تیلن کھانا لے کر آئی عین اس وقت وہ کالی کتیا جو ہر روز اپنے پلے کے ساتھ کھانے کے وقت وہاں آ جاتی تھی دروازے میں آ کر اکڑوں بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی

کہ کب حسو کھانا کھائے اور کوئی ہڈی یا لقمہ اس کی طرف پھینکے۔ اس دوران میں اس کا پلا کھانے کی خوشبو سونگھتا کھانے تک پہنچ گیا۔ اور کندوری میں منہ ڈال روٹی کھینچ مزے سے کھانے لگا۔ حسو کی نظر پڑی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پلے کو گردن سے پکڑا اور چلتے کولھوں میں پھینک کر پیل دیا۔ کتیا اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور وہاں سے ہٹ گئی۔ اس روز کتیا وہاں سے ہٹ گئی۔ مگر جب حسو کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اکثر اس کے گھر کے گرد منڈلانے لگی۔ اور تاک میں رہتی کہ کب موقع ملے اور وہ اس کے بیٹے کو چبا کر اس سے انتقام لے۔

ایک دن کا ذکر ہے تیلی تیل بیچنے کہیں گیا ہوا تھا۔ تیلن گھر میں گوبر کا لیپ کر رہی تھی اور بچہ پالنے میں لیٹا رو رہا تھا کہ کتیا کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ موقع پر پا کر دبے پاؤں اندر آئی اور بچے کو منہ میں اٹھا کر باہر لے گئی۔ پھر ایک ویران گوشے میں پہنچی اور چاہا کہ اسے چبا جائے کہ بچہ قلقاری مار کر ہنس پڑا۔ کتیا نے اسے پہچان لیا۔ وہ حسو تیلی کا لڑکا مگر اندر سے اس کا پلا تھا۔ پھر وہ بڑا ہو گیا۔ مگر وہ اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے حسو کے گھر کے چکر لگاتی رہتی۔ پھر لڑتا جھگڑتا' بات بات پر گالیاں دیتا۔ اور بیل اور بیوی کو پیٹتا حسو ایک روز بیمار پڑ کر مر گیا۔ اور ایسا کہا ہے کہ جنونی اور جذباتی کی عمر تھوڑی ہے۔ اور حاسد اپنے غصے کی آگ میں جل کر جلد راکھ ہو جاتا ہے۔ سو حسو اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو گیا۔ اور تیلن بچے کو لے کر کسی دوسرے نگر چلی گئی۔ کتیا کچھ عرصہ تک انتظار کرتی رہی کہ شاید تیلن بچے کو لے کر واپس آ جائے۔ پھر مایوس ہو کر ڈھونڈنے نکلی اور نگر نگر گھومتی طرح طرح کے کتوں سے لڑتی اور مار کھاتی دربدر پھرتی رہی۔ اسی تلاش کے دوران میں وہ زخمی ہو گئی اور پر جا محل کے باغ میں پہنچ کر مر گئی۔

یہ سنا کر بیتال بولا۔ راجا اگر تم اس کے پلے تیلی کے بچے کا اتا پتا معلوم کر سکو تو میں تمہیں یہ مردہ لے جانے دوں گا اور پر جا باغ سے چلا جاؤں گا۔ تب تک مجھے تنگ کرنے کا کچھ فائدہ تم کو حاصل نہ ہو گا۔ یہ کہہ کر بیتال پھر چلا گیا اور جا کر اسی درخت سے لٹک گیا۔

راجہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ واپس جا کر اسے پھر باندھ لائے یا تیلی کے اس بیٹے کی تلاش کو نکلے۔ جو کتا تھا مگر آدمی کے شریر میں رہتا تھا۔ تب راجہ کو بہت سے آدمی یاد آئے جن سے مل کر یقین نہ آتا تھا کہ وہ آدمی ہیں۔ آدمیوں میں کتے کو تلاش کرنا آسان جان' راجہ نے فیصلہ کیا کہ وہ بیتال کی شرط جیت کر واپس آئے گا۔ اور پر جا محل اور باغ کو بھوت پریت اور چنڈالو کے قبضے سے آزاد کرائے گا۔

یہ اپنے من میں وسوچ' راجا اپنے نگر آیا۔ اور ہر اس سے ملا جس پر اسے یا لوگوں کو ذرا سا بھی شک ہوتا کہ ان میں آدمیت نہیں ہے لیکن بات چیت اور میل ملاپ کے بعد ہر کسی میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو نکل آتا کہ راجا کو اپنا خیال بدلنا پڑ جاتا تب راجہ کو احساس ہوا

کہ جس کام کو آسان جانتا تھا' وہ بہت کٹھن نکلا۔ایک آدمی کہ کتا تھا آدمیوں میں آدمی کی طرح رہتا۔انہی کی طرح اٹھتا بیٹھتا کھاتا پیتا اور سارے کام کرتا تھا' اسے ان سے الگ کر کے پہچاننا اور ڈھونڈھ نکالنا پاتال کی خبر لانے سے کم کٹھن نہ تھا۔اس حال میں دیکھ کر ایک روز پرجارانی نے پوچھا: راجا بیٹے۔۔۔۔۔۔ماں واری۔۔۔۔۔۔کہو کیا چنتا تمہارے من کو لگی۔

راجا نے سارا ماجراہ کہہ سنایا۔اس پر رانی کہنے لگی:

یہ تو بڑا کٹھن کام ہے بیٹے۔بدذاتوں نے محل اور باغ پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لئے تجھے ایسا کام سونپ دیا ہے کا ہونا بڑا مشکل ہے۔ایک کتا جو آدمیوں رل مل گیا ہے' اسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔بیٹے تو ہمت نہ ہار۔بس ایسا کر کہ کتے اور آدمی کی خصلتوں پر نظر رکھ' دیکھ کہ کس آدمی میں ایسی کوئی خصلت ہے جو دوسروں میں نہیں' صرف کتوں میں ملتی ہے۔

راجا بولا: یہی تو مشکل ہے ماں۔۔۔۔۔۔وہ کتا جو شروع دن سے آدمیوں میں رہتا ہوا انہیں میں پلا بڑھا ہوا اور انہی کی زبان بولتا ہو اس میں تو آدمیوں کی بھی بہت سی باتیں شامل ہو گئی ہوں گی۔ایسے میں اسے اتنے لوگوں میں الگ کر کے کیسے پہچانوں۔

پرجا بولی' صدقے جاؤں۔جو میری آنکھیں دیکھ سکتیں تو میں تیری مدد کرتی پر اب تو تو ہی میری آنکھیں ہے۔راجا بیٹے تو دل چھوٹا نہ کر جو تو سدھ بدھ سے کام لے گا تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالے گا۔

پھر پرجارانی نے اس کی سات موٹی موٹی نشانیاں بتائیں۔پہلی نشانی یہ ہے کہ بات بات پر گلے پڑ جانے اور ذرا سے اختلاف پر بھڑک جانے والا ہو گا۔کیوں کہ ایک تو وہ کتا ہے۔دوسرے غصیلے اور شیخی خورے حسوتیلی کا بیٹا اس لئے بہت ہی کم ظرف' بدمزاج اور ٹیڑھا آدمی ہو گا۔

دوسری نشانی یہ کہ غیروں کا وفادار ہو گا۔مگر اپنوں کا بیری ہو گا۔

تیسرے یہ کہ حرص و ہوس کا پجاری ہو گا۔پیٹ اور نیت کبھی نہیں بھرتے ہوں گے۔کھانے اور خطرے کی بو دور سے سونگھ لیتا ہو گا۔

چوتھے یہ کہ اپنی برائیوں پر اتراتا ہو گا۔

پانچویں یہ کہ شریف اور نہتے آدمیوں پر بلاوجہ غراتا۔مگر جہاں کہیں سے ڈر یا فائدے کی توقع ہو گی' وہاں مثل اپنی اصل کے پاؤں چاٹتا اور دم ہلاتا ہو گا۔

چھٹی یہ کہ اپنے ساتھیوں' دوستوں اور ان لوگوں کو موقع ملتے ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا جنہوں نے اس سے کبھی کوئی

نیکی کی ہوگی یا جو اس سے رتبے میں آگے ہونگے۔

اور ساتویں نشانی اس کی یہ ہے کہ اس کی وفاداری مشروط اور مشکوک ہوگی۔ کیوں کہ کتے کی وفاداری دراصل ایک کھلی خوشامد ہوتی ہے۔ جو اسے راتب ڈالتا ہے' اسی کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

راجا یہ سن کر پریشان ہوگیا۔ بولا:

ماں یہ سب باتیں تو بہت سے آدمیوں میں ہیں۔ شاید بعض کتوں میں نہ ہوں۔ میں اسے اس طرح کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں۔

پرجا بولی تو ایسے تمام لوگوں کی فہرست بنالا۔ بیٹے یہ تیری عقل کا امتحان ہے۔ تو بدوں کی جو فہست بنا کر لائے گا' اس میں وہ ضرور شامل ہوگا۔ اور ایسا کہا ہے کہ جو آدمی نیکوں کی بدوں سے اور بدوں کو نیکوں سے الگ کر کے پہچان سکتا ہے' وہ بدی اور شر کو مٹانے کا اہل ہوتا ہے۔ سو جب بیتالوں سے بدذاتوں کو پتہ چلے گا کہ پرجا کے سوجھوان بیٹے کو سارے بدوں کا علم ہے تو وہ پرجا محل سے اٹھ جائیں گے۔

یہ سن راجہ بہت خوا ہوا۔ ماں کی بات پلے سے باندھ نگر نگر گلی گلی گھومنے لگا۔ جہاں جہاں سنتا کوئی اندر یا باہر سے غیر آدمی لگتا ہے' اس کا نام پتہ لکھتا جاتا۔ اس طرح سیکڑوں ہزاروں ناموں کی ایک لمبی فہرست بن گئی۔ راجا دل میں فکر کرتا کیا پتہ وہ بدذات اس میں شامل ہوا تھا یا نہیں۔

پھر کتنے دنوں بعد ایک دن راجا نے دل میں ٹھانی کہ پرجا محل جائے۔ سو اس نے کاغذ جیب میں ڈالا۔ تلوار اٹھائی اور جنگل کی راہ لی۔ راستہ کٹھن اور اونچا نیچا تھا۔ گھاٹیاں پربت' دریا اور ندی نالے' خاردار جھاڑیاں اور سرکنڈے دامن پکڑتے۔ بھوت پلید راستہ روکتے اور کنکر پتھر پاؤں سے ٹکراتے تھے۔ مگر راجا دھن کا پکا دم لئے بغیر آگے ہی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب آدھی رات ادھر تھی اور آدھی ادھر وہ پرجا باغ میں جا داخل ہوا۔

دیکھتا کیا ہے کہ محل میں چار سو روشنی ہو رہی ہے۔ قندیلیں جلتی اور اگر بتیاں سلگتی ہیں۔ نہر میں پانی بہتا ہے۔ جا بجا فوارے اچھل رہے ہیں۔ حوضوں میں چاند کی کرنیں ناچتی ہیں۔ اور ٹھنڈی خنک ہوا پھولوں سے کھیلتی ہے۔ راجا خوشی سے اچھل پڑا۔ بولا: پرجا ماں تیرا محل آباد ہوگیا۔ تیرا باغ آج سے آزاد ہوگیا۔

تب کہیں سے کالے رنگ کی ایک کتیا جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی تھیں ایک پلے کے ساتھ نمودار ہوئی۔ دم ہلا کر اور سر جھکا کر راجا کی اور دیکھا اور پلے کو ساتھ لئے باغ سے باہر چلی گئی۔



اوپر جانے والا

توتے نے کہا: ان کا اپنا بھی قریب یہی حال ہے مگر پانچواں جو سب سے چھوٹا اور کمزور ہے بھوک کی شدت سے بری طرح نڈھال نظر آتا اور بار بار بے ہوش ہو جاتا ہے۔

وہ کئی روز سے اس پر اسرار اور بے آب و گیاہ جزیرے میں بھٹک رہے ہیں جس کا سمندر مچھلیوں سے اور ساحل درختوں اور پرندوں سے خالی ہے۔ ان کے پاس خوراک بچی ہی کتنی تھی کہ ساتھ دیتی صرف پانی کی چھاگل رہ گئی ہے اس میں بھی تھوڑا سا پانی ہے۔ جسے وہ قطروں کے حساب سے استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

وہ دن بھر خوراک کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں شاید کہیں کوئی شکار یا پھل دار درخت نظر آ جائے جس سے وہ اپنی بھوک مٹا سکیں اور کسی امدادی جہاز یا کشتی کی آمد تک زندہ رہ سکیں مگر انہیں اب تک ہر طرف سے مایوسی ہوئی ہے۔ تاہم امید کی ایک کرن چوتھی اور آخری سمت کے سفر کی صورت ابھی باقی ہ۔ کیا پتہ وہاں کسی قسم کی حیوانی یا نباتی خوراک مل ہی جائے مگر پانچواں اس قدر نڈھال ہے کہ دو قدم چل نہیں سکتا۔ یوں اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ انہیں موت سے زیادہ، تاریخ میں برے ناموں سے یاد کئے جانے سے ڈر لگتا ہے۔

کچھ دیر سوچ بچار کے بعد وہ اسے ایک جھلنگے میں ڈال لیتے ہیں اور اسے چاروں کونوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ اٹھائے پھرنے لگتے ہیں۔ تھکاوٹ غالب آ جاتی ہے تو کچھ دیر ستا لیتے ہیں پھر رہی سہی طاقت جمع کر کے دوبارہ چلنے لگتے ہیں۔ انہوں نے باہمی رضامندی سے پانی پینے کی مقدار اور گھٹا دی ہے اور اپنے حصہ کی بوندیں بھی جھلنگے میں پڑے نیم بے ہوش پانچویں کے حلق میں ٹپکاتے رہتے ہیں۔

چلتے چلتے دوپہر ہو جاتی ہے۔ سورج پوری شدت سے چمکنے لگتا ہے پاؤں تلے کی بھری بھری ریت اور مٹی دہکنے لگتی ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارتے۔ کیا پتہ چوتھی کھونٹ کھانے پینے کو کچھ مل ہی جائے۔

ان کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور بدن جھلس کر سیاہ ہو جاتے ہیں مگر وہ اسے اٹھائے گرتے پڑتے چلتے رہتے ہیں۔ تب اچانک ان کی نظر ایک ہرے بھرے درخت پر پڑتی ہے جو دور سے ناریل کا پیڑ نظر آتا ہے۔

اس لمحے جب چھاگل میں بہت تھوڑا پانی اور بدنوں میں برائے نام طاقت رہ گئی ہے ویرانے میں اکیلا کھڑا یہ ہرا بھرا درخت انہیں ایک بڑے نخلستان کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ مارے خوشی کے وہ چھاگل کی بچی کھچی ساری بوندیں نیم ہوش پڑے پانچویں کے حلق میں ٹپکا دیتے ہیں جس سے وہ نہ صرف ہوش میں آجاتا ہے بلکہ اس میں اتنی توانائی آجاتی ہے کہ اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ناریل کے پیڑ کی طرح نظر آنے والے اس درخت کا پھل بھی ناریل جیسا ہے لذیز' خوش ذائقہ اور رس بھرا۔ مگر اتنے بڑے پیڑ پر گنتی کے چند پھل نظر آتے ہیں اور اس پر چڑھنا اور پھل توڑ کر لانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ پریشان ہو کر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے ہیں مگر پانچواں جو سب سے زیادہ تروتازہ اور چاق چوبند نظر آتا ہے آگے بڑھ کر کہتا ہے:

''میں اوپر جاؤں گا اور سب کے لئے پھل توڑ کر لاؤں گا۔''

''نہیں تم نہیں'' دوسرا بزرگانہ شفقت سے کہتا ہے ''تم چھوٹے اور کمزور ہو میں خود جاؤں گا۔''

''اگر تم چاہو تو میں جاتا ہوں۔'' تیسرا کہتا ہے۔

''شاید تم لوگ بھول گئے'' پانچواں کہتا ہے ''ایسے درختوں پر چڑھنے کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے'' دوسرا کہتا ہے ''مگر تم چھوٹے اور نحیف ہو ہم ڈرتے ہیں تمہیں نقصان نہ پہنچے ہم واپس جا کر کیا منہ دکھائیں گے۔''

''تم بالکل فکر نہ کرو'' پانچواں کھمبے کی طرح کھڑے درخت کے چکنے اور گول تنے کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے ''بس کسی طرح مجھے پہلی ڈال تک پہنچا دو اس کے بعد اوپر جانا آسان ہو جائے گا۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے'' چوتھا کہتا ہے ''اگر ہم چاروں ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو کر ایک سیڑھی سی بنا دیں تو پانچواں آسانی سے پہلی ڈال تک پہنچ سکتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے بہت اچھی ترکیب ہے مگر ہم میں سے کس میں اتنی ہمت ہے کہ سب کا بوجھ سہارنے کے لئے پہلے نمبر پر کھڑا ہو۔''

سارے چپ ہو جاتے ہیں۔

''قرعہ اندازی کر لیں؟''

"قرعہ اندازی کی نہیں یہ تو ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔"

"میں نیچے کھڑا ہوں گا۔" پہلا پیش کش کرتا ہے۔

"اس کے بعد میں" دوسرا کہتا ہے۔

"اس کے بعد میرا نمبر ہوگا۔" تیسرا کہتا ہے۔

"ظاہر ہے اس کے بعد میرا" چوتھا کہتا ہے۔

ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے ہاور خصوصاً پہلے کو داد شجاعت دیتے ہوئے وہ رہی سہی طاقت جمع کر کے پیڑ کے تنے سے لگ جاتے اور ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پانچواں چھاگل نچوڑ کر حلق تر کرتا اور نہایت پھرتی سے ان کی کمروں اور کندھوں پر پاؤں جماتا اوپر چڑھنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلی ڈال تک جا پہنچتا ہے۔ پہلی سے دوسری اور پھر تیسری ڈال پر قدم رکھتا وہ بلند ہوتا جاتا ہے۔

وہ ایک دوسرے کے کندھوں سے اتر کر اپنے اپنے کندھے اور پسلیاں سہلاتے اور پانچویں کے چوٹی پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں مگر پہلا اب تک اپنی جگہ درخت کے تنے کے ساتھ لگا کھڑا ہے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتا شاید اس لئے کہ وہ کیس کے کندے پر سوار نہیں ہوا کہ کوئی اسے اپنا کندھا جھٹک کر نیچے اترنے کو کہتا۔ وہ زمین پر کھڑا ہے اور زمین کبھی کندھے جھٹک کر نہیں گراتی۔ آدمی خود بخود گر جائے تو بھی اسے پناہ دیتی ہے۔ سو زمین نے اسے پناہ دی۔

وہ خوف اور صدمے سے ایک عجیب دہشت ناک منظر دیکھتے ہیں پہلا ۔۔۔۔۔۔ گھٹنوں تک زمین کے اندر دھنسا ہوا ہے اور اب اسے اوپر سے پھینکنے جانے والے پھل کا انتظار ہے نہ اس کا ذائقہ جاننے کی آرزو ۔۔۔۔۔۔

وہ پریشانی میں تھوڑی دیر کے لئے اوپر والے کو بھول جاتے ہیں۔ پہلے کو مٹی سے باہر نکالتے اور پھر مٹی میں دبا دیتے ہیں۔ اس کی شجاعت اور ایثار کو سراہتے اور اس کی نیکیوں کو یاد کرتے ہیں۔ پھر دوسرا اوپر منہ کر کے دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے:

"وہ جس نے ہم سب کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا اب ہم میں نہیں رہا۔"

"ہاں ۔۔۔۔۔۔ اب ہم تین رہ گئے ہیں ہم بھوک سے نڈھال اور پیاس سے بے حال ہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

مگر پانچواں کوئی جواب نہیں دیتا۔

اسی لمحے کوئی چیز نیچے گرتی ہے وہ بیتابی سے لپکتے ہیں مگر یہ دیکھ کر ان کے مرجھائے ہوئے چہرے اور مرجھا جاتے ہیں کہ وہ ناریل

ایسے پھل کا لکڑی کی طرح خشک اور سخت چھلکا ہے۔

اوپر سے گرائے جانے والے پھل کا انتظار کرتے کرتے شام ہو جاتے ہے اور سمندر کی طرف سے ہولناک اندھیرا امنڈ نے لگتا ہے مگر پانچواں پھل نیچے گراتا ہے نہ ان کی کسی بات کا جواب دیتا ہے۔اوپر دیکھ کر ان کی آنکھیں اور گردنیں تھک جاتی ہیں اور پکار پکار کر ان کے گلے خشک ہو جاتے ہیں۔

''کہیں پھر بے ہوش نہ ہو گیا ہو؟''

''پھل زہریلا بھی تو ہو سکتا ہے اسے کچھ ہو نہ گیا ہو؟''

''کیا پتہ پیٹ بھر کر کھا پی لینے سے اسے نیند آ گئی ہو گزشتہ کئی دنوں سے مارے بھوک اور پریشانی کے ہم میں سے کوئی سویا بھی تو نہیں اور پھر نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔''

اسی لمحے لکڑی کی طرح سخت اور چھلکے پھر ان کے قریب سے گرتے ہیں جنہیں وہ چکھ اور سونگھ کر پھینک دیتے ہیں۔

''وہ خود کھا پی رہا ہے۔''

''کھا لینے دو۔۔۔۔۔۔۔اس میں طاقت اور توانائی آئے گی تبھی وہ ہمارے لئے پھل توڑ سکے گا۔''

''ہاں اس کی طاقت ہماری طاقت ہے۔''

''مجھے تو شک ہے'' دوسرا کہتا ہے۔

''کس بات کا؟'' تیسرا پوچھتا ہے مگر دوسرا کوئی جواب نہیں دیتا۔اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔

وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ہوش میں نہیں آتا دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہے۔

تیسرا اور چوتھا خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں پھر اسے کھینچ کر پہلے کی قبر کے پاس ڈال دیتے ہیں شاید اب ان میں قبر کھودنے کی ہمت نہیں رہی۔پھر چوتھا گھبرا اور گڑگڑا کر اوپر والے کو اطلاع دیتا ہے۔

''سنو اب ہم دو رہ گئے ہیں اگر تم نے جلدی نہیں کی تو ہم بھی نہیں بچ سکیں گے۔''

''تم ٹھیک تو ہو پانچویں؟'' تیسرا پوچھتا ہے۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' پہلی بار اوپر سے پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ خوشی اور امید بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔تیسرا کہتا ہے۔''اگر تم ٹھیک ہو تو ہمارے لئے کچھ پھینکتے کیوں نہیں

ہو۔"

"پھل بہت تھوڑے اور دور دور ہیں ان کا توڑنا بہت مشکل ہے میں صبح کوشش کروں گا۔"

"ہم میں صبح تک انتظار کرنے کی ہمت نہیں پانچویں۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔"

"کیا تم چاہتے ہو" پانچواں خفگی سے کہتا ہے "اندھیرے میں پھول توڑنے کی کوشش میں میں پھسل کر نیچے گر جاؤں۔"

"نہیں" چوتھا کہتا ہے "تمہاری سلامتی ہماری سلامتی ہے تم کوئی خطرہ مول نہ لو۔۔۔۔۔۔ ہم صبح ہونے کا انتظار کریں گے۔"

"کچھ فائدہ نہیں۔" تیسرا سرگوشی کرتا ہے۔ "اس کی نیت اوپر پہنچتے ہی خراب ہو گئی ہے اب ئی حیلے بہانوں سے ہمیں یونہی ٹالتا اور ہمارے مرنے کا انتظار کرتا رہے گا دیکھ لینا۔"

"آہستہ بولو چوتھا کہتا ہے "اس نے سن لیا تو برا مان جائے گا اب ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن ہمیں تحمل سے کام لینا چاہئے اور اسے ناراض نہیں کرنا چاہئے کیا پتہ؟"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ لمبی دوڑوں میں حصہ لیتا رہا ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے لیکن لمبی دوڑوں کا اس وقت کیا ذکر؟"

"لمبی دوڑ جیتنے کا ایک گر یہ بھی ہے کہ مقابلے کے آخری لمحوں یا چکر کے لئے کچھ توانائی بچا کر رکھی جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب ہم اسے بے ہوش اور نڈھال سمجھ کر جھلنگے میں اٹھائے پھرتے رہے تو اس نے آخری چکر کے لئے اپنی توانائی بچا لی۔"

"تمہارا خیال ہے وہ اتنا نڈھال اور بے ہوش نہیں تھا؟"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ اس کی چالاکی تھی۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو مجھے یاد آ رہا ہے جب ہم بڑے ٹیلے کے پاس دم لینے کو رکے تھے۔ میں نے اسے کن انکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھا تھا مگر اس وقت مجھے بالکل خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے درخت پر گنے چنے پھل ہیں اور امدادی جہاز یا کشتی کے آنے میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں اسی خیال سے پانچویں

کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔اور اب یقیناوہی اکیلا امدادی جہاز کا استقبال کر سکے گا۔''

''پھر کیا کریں؟''

''پہلے کی ہمت اور حوصلے کو یاد کریں اور مایوس نہ ہوں کیا پتہ وہ صبح اپنا وعدہ پورا کر دے۔''

''ہاں اس کے سوا ہم کر بھی کیا کر سکتے ہیں۔''

تیسرا اور چوتھا ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قریب قریب لیٹ جاتے ہیں۔تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی نبض یا سانس ٹٹول لیتے ہیں' لحظہ لحظہ رات ڈھلتی اور صدیوں بعد صبح طلوع ہوتی ہے۔

''تیسرے تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں اور تم''

''میں بھی ٹھیک ہوں''

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں اگر آج بھی اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو ہم بھی جلد ہی''

''سنو'' تیسرا کہتا ہے''شاید وہ پھل توڑ رہا ہے۔''

''ہاں'' چوتھا کہتا ہے''تم اسے آواز دو۔''

''نہیں۔۔۔۔۔۔۔وہ تمہاری بات مانے گا۔'' تیسرا کہتا ہے۔''تم اسے آواز دو''

''پانچویں'' چوتھا آواز دیتا ہے''صبح ہو گئی اپنا وعدہ پورا کرو''

پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''پھل توڑے ہیں' ہمیں کفایت سے کام لینا ہوگا بس تم شام تک انتظار کرو۔''

شام کا نام سن کر دونوں دہل جاتے ہیں۔پھر ایک کہتا ہے۔

شام تک ہم مر چکے ہوں گے پانچویں۔ہم پر رحم کھاؤ۔''

''میں شام کو اپنا وعدہ پورا کروں گا مجھے پریشان نہ کرو۔''

''اول تو ہم شام تک زندہ نہیں ہوں گے۔'' تیسرا کہتا ہے''اور اگر زندہ بچ بھی گئے تو بھی یہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو'' چوتھا کہتا ہے ''اس کی نیت واقعی خراب ہے۔''

''آہ ہم اسے تھامے اٹھائے پھرے اسے اپنے حصے کا پانی پلاتے اور اپنی رہی سہی توانائی خرچ کرتے رہے اسے کندھوں پر سوار کر کے اوپر پہنچایا اور اب وہ ہمیں سسک سسک کر کرتے دیکھ رہا ہے۔''

''توتا چشم'' تیسرا کہتا ہے۔

''میں سن رہا ہوں'' پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے تم مجھے برا بھلا کہہ رہے ہو۔''

''میں تمہارا خون پی جاؤں گا'' تیسرا اب تک غصے میں ہے۔

''پاگل کے بچو'' پانچواں کہتا ہے ''اگر تم مجھے گالی نہ دیتے تو شاید مجھے تم پر ترس آ جاتا مگر تم خود بھی مرنا چاہتے ہو۔''

''ایسا نہ کہو پانچویں'' چوتھا کہتا ہے ''اسے معاف کر دو۔ بھوک پیاس کی شدت اور موت کے خوف سے ہم واقعی پاگل ہو رہے ہیں۔''

''معافی مانگو''

تیسرا معافی مانگتا ہے۔

''ایسے نہیں'' پانچواں کہتا ہے ''ناک رگڑ کر۔''

''مجھ میں ناک رگڑنے کی سکت نہیں'' تیسرا کہتا ہے ''دیکھ میں ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے معاف کر دو۔''

''اگر تم ناک سے لکیریں نہیں نکال سکتے تو مجھے افسوس ہے میں شام کو بھی تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں گا۔''

''میں کوشش کرتا ہوں'' تیسرا زمین پر ناک رگڑنے کے لئے جھکتا ہے۔

''ایسا نہ کرو'' چوتھا کہتا ہے ''پہلے کی شجاعت کو یاد کرو اس نے جان دیتے وقت اف تک نہیں کی تھی۔''

بھوک اور پیاس نے میری ہمت کو پست کر دیا ہے مجھے پستی اور بلندی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا۔''

''یہ زوال ہے۔'' چوتھا کہتا ہے مگر تیسرا جھکتا چلا جاتا ہے۔

جھکنے سے تیسرے کی پھٹی ہوئی جیب سے کوئی چیز باہر آ گرتی ہے۔

''ارے یہ تو چاقو ہے۔'' چوتھا خوشی سے کہتا ہے ''ٹھہر جاؤ ناک رگڑنے کی ضرورت نہیں۔''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' تیسرا ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

''ڈرو نہیں۔۔۔۔۔۔۔ہم اس درخت کو کاٹیں گے۔''

''اتنے چھوٹے سے چاقو سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اتنا بڑا درخت کاٹ کر گرا دیں۔''

''ہاں یہ مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تم نے کبھی ہدہد کو دیکھا ہے جو اپنی چونچ سے۔''

''ہاں دیکھا ہے''

''یہ تو پھر چاقو ہے۔ لوہے کا بنا ہوا اور آدمی کے ہاتھ میں ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''پھر ہمارا مقصد محض درخت گرانا نہیں۔''

''پھر؟''

''کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ناک یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے امدادی جہاز یا ملک الموت کے آنے تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ اور انہیں تو اوپر والا ہم سے ناکیں تو نہیں رگڑوا سکے گا۔ اور تب تک بے فکری کی نیند تو نہیں سو سکے گا۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ایسے حالات میں پستی سے بچنے کے لئے اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے''

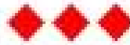
''مگر میں سوچتا ہوں تیسرے ایسا کرنے سے ہمارے اور پانچویں میں کیا فرق رہ جائے گا؟''

''نہیں۔۔۔۔۔۔ہم ایسا نہیں کر سکتے۔'' چوتھا کہتا ہے'' ورنہ ہم تاریخ کو اور پہلے کو کیا منہ دکھائیں گے؟''

''پھر؟''

''پھر ہمیں انتظار کرنا ہوگا جب تک کر سکیں کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔''

''پھر کیا ہوا میاں مٹھو؟'' میں پوچھتا ہوں۔ مگر توتا میری بات کا جواب دیئے بغیر اڑ کر ایک اونچے ڈال پر جا بیٹھتا ہے اور پھل کتر کتر کر کھانے لگتا ہے۔



اگلی صف کا آدمی

ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ اوپر سے ہر ٹریفک سگنل راستہ روک لیتا۔

چھوٹا کہنے لگا "جب پہلا سگنل بند ملے تو پھر سارے سگنل بند ہی ہوتے ہیں۔" "یہ ضروری تو نہیں۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا "مگر آج ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"کہیں ہم گاڑی سے نہ رہ جائیں؟" وہ بولی۔

"گاڑی کی فکر نہ کریں جی" ڈرائیور نہایت اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کہنے لگا "گھنٹوں کے حساب سے لیٹ ہوتی ہیں۔"

"اور اگر آج گاڑی وقت پر آ گئی تو؟"

"ابھی کافی وقت ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

ہم نے اطمینان کا سانس لینا چاہا مگر اگلے چوک پر پھر رکنا پڑا کیونکہ سگنل بند تھا۔ یہاں گاڑیوں کی اتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی کہ اگر ٹریفک سگنل کھلا بھی ملتا تب بھی ہم بتی سرخ ہو جانے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور جب تک بتی سرخ سے سبز ہوئی ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے چھوٹی بڑی گاڑیوں' بسوں' رکشاؤں' ریڑھیوں اور ٹرکوں کی قطاریں لگ گئیں۔ ٹریفک سگنل یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ مگر اس کی بتیاں نظر آ رہی تھیں جو باری باری سرخ سبز ہوتی رہیں مگر ٹریفک حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سبھی لوگ اپنی جگہ بے چین تھے۔ ہارن بج رہے تھے۔ انجن چل رہے تھے۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ رکے کھڑے تھے۔

ہم بار بار گھڑیاں دیکھتے اور پریشان ہوتے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مگر کوئی گاڑی آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ ادھر گاڑیوں کی دوہری تہری قطاروں کے درمیان خالی جگہوں پر موٹر سائیکل اور سکوٹر سوار گھسے چلے آتے تھے۔

ڈرائیور نے سر باہر نکالا اور دائیں جانب والے ٹرک ڈرائیور سے جو نسبتاً آسانی سے چوک کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ پوچھا مگر اسے خود اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ٹریفک جام ہونے کی کیا وجہ ہے۔ پھر وہ بائیں جانب والی بس کے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

"استاد کیا گڑبڑ ہے؟"

"چوک میں شاید کوئی گاڑی خراب ہو گئی یا الٹ گئی ہے۔"

''اف خدایا'' وہ بولی ''اب کیا ہوگا؟''

''وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔'' چھوٹے نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے بی بی جی۔'' ڈرائیور نے کہا ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ابھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''چوک میں شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔'' ہمارے پیچھے والے ریڑھا مزدور نے تیز دھوپ میں کھڑے اپنے کسی ساتھی کو بتایا۔

حادثے کا نام ن کر چھوٹا بولا ''پھر بڑی دیر ہو جائے گی۔''

''حادثہ نہیں جی'' ڈرائیور بولا ''رش کا وقت ہے۔ یہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔''

اسی لمحے چوک کی طرف سے دو آدمی گاڑیوں کے درمیان میں سے راستہ تلاش کرتے ہوئے آئے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کہنے لگا:

''انجن بند کر کے مزے سے آرام کریں استاد۔''

''ہاں بے شک کچھ دیر سو لیں۔'' دوسرا بولا۔

''کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟''

''نہیں استاد ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ضد میں گاڑیاں پھنس گئی ہیں۔''

ہم اور زیادہ پریشان ہو گئے۔ ظاہر تھا کہ وہاں سے جلدی نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہمیشہ یہ مسئلہ رہتا ہے کہ وہ معمولی سی بات پر نروس ہو جاتی ہے۔ اور انتظار کے لمحوں میں تو بہت ہی بے چین اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''کوئی بات نہیں اگر ایک گاڑی چھوٹ گئی تو ہم دوسری ٹرین سے چلے جائیں گے۔''

''دوسری ٹرین سے؟''

''ہاں کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ جہاں رات گیارہ بجے پہنچنا ہے۔ وہاں دو گھنٹے لیٹ پہنچ جائیں گے۔''

''یعنی کل کی تاریخ میں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق کیوں نہیں پڑتا۔۔۔۔۔۔ آپ کو تو پتہ ہے۔ ہمارا آج کی تاریخ میں پہنچنا کتنا ضروری ہے۔''

''ان سب لوگوں کو جو ہاں رکے کھڑے ہیں۔کہیں نہ کہیں جلدی اور ضروری پہنچنا ہے۔''''

''وہ تو ٹھیک ہے۔مگر بڑی مشکل پڑ جائے گی''

''پھر کیا کیا جائے؟''

''کیوں نہ اتر کر پیدل چلیں''چھوٹا کہنے لگا''چوک سے آگے جا کر دوسری ٹیکسی لے لیں گے۔

''یہ ٹھیک کہتا ہے۔''وہ بولی''مگر سامان کا کیا ہوگا۔''

''تھوڑا تھوڑا سب اٹھا لیتے ہیں۔''چھوٹے نے جواب دیا۔

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے اور ڈرائیور سے معذرت کرتے ہوئے ہم سامان اٹھا کر چل دیئے۔مگر آگے پیدل چلنے کا راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ناچار ہم پچھلے چوک کی طرف روانہ ہوئے ہم نے پروگرام بنایا کہ پچھلے چوک سے ایک دوسرے راستے سے ہوتے ہوئے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کریں۔

اتفاق سے ہمیں دوسری ٹیکسی آسانی سے مل گئی۔اور ہم متبادل رستے پر چل پڑے۔مگر تھوڑی دور جانے کے بعد پتہ چلا کہ یہ سڑک بھی ٹریفک رکنے سے بند ہو چکی ہے۔مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی ٹیکسی کے بڑھتے ہوئے کرایہ کی پروا کی اور ایک تیسرے راستے سے جو خاصا طویل تھا'اسٹیشن کا رخ کیا۔مگر بدقسمتی سے ہم اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ٹریفک منجمد ہونے کے اثرات یہاں تک پھیل چکے تھے۔چنانچہ ہم واپس اس مقام پر آ گئے جہاں سے ٹریفک کھلنے کی صورت میں فاصلہ کم پڑتا تھا اور جہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی لی تھی۔مگر اب یہاں بھی ٹریفک کا دباؤ تھا۔اور ہر لمحے گاڑیوں کی لمبی قطاریں مزید لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔اب ہماری پہلی ٹرین یقیناً نکل چکی تھی۔شاید ہم دوسری گاڑی پکڑ سکیں اس امید کے ساتھ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ٹریفک کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔۔

''اس سے بہتر ہے کہ ہم رات کو دیر سے پہنچیں''وہ بولی''سفر ہی ملتوی کر دیا جائے۔''

''اب تو واپس کا راستہ بھی بند ہو چکا ہے''ڈرائیور نے اطلاع دی۔

''تو کیا ہم واپس گھر بھی نہیں جا سکتے''چھوٹا بولا۔

''بہت مشکل ہے برخوردار''ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

''مجھے لگتا ہے ہم دوسری گاڑی بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔''

''اوہ میرے خدا'' وہ پریشان ہوگئی۔ ''یہ تو بہت تکلیف دی بات ہے۔''

''اب صورت حال یہ تھی کہ تمام شہر کا ٹریفک منجمد تھا اور ہر سڑک اور بازار میں ہر لمحے گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور جس طرح دریا بہتا رہے تو وہ دریا رہتا ہے رک جائے تو جھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور سیلاب بن کر سب کچھ ڈبو دیتا ہے۔ اس طرح ٹریفک چلتا رہتا ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ کتنی سیکڑوں گاڑیاں گزر گئیں۔ مگر جب ایک پل کے لئے بھی رک جائے تو پھر کئی طرح کی دوسری خرابیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہر کوئی جھنجلایا ہوتا ہے اور ایک دوسرے میں گھسا چلا آتا ہے بعض گاڑیوں کے انجن بند ہو جائیں تو دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوتے۔ اگر ٹریفک کھل جائے تو بھی ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی وجہ سے کنفیوژن اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں تو ٹریفک کے حرکت میں آنے کے آثار دور دور تک نظر نہ آتے تھے بعض ڈرائیوروں نے سڑک کے بیچ جہاں وہ تھیں گاڑیاں بند کر دی تھیں اور خود کسی دوسرے ڈرائیور یا جاننے والے سے گپ شپ لڑانے چلے گئے تھے بعض نے قریبی چائے خانے کا رخ کیا تھا۔ خود ہمارا ٹیکسی ڈرائیور فرصت پا کر شیو بنوا آیا تھا۔ آج گرمی بھی اپنے عروج پر تھی۔ بسوں' ویگنوں' سوزوکیوں اور کاروں میں ٹھسے ہوئے لوگوں کا مارے گرمی حبس اور پیاس کے برا حال ہو رہا تھا۔ دھویں اور ڈیزل کی بدبو نے فضا کو اور بھی مکدر کر دیا تھا۔ انجنوں اور ہارنوں کے شور سے کان پھٹ رہے تھے =ٹریفک پولیس کے سپاہی جگہ جگہ بے نتیجہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ = مجھے ان مزدوروں کا خیال آ رہا تھا جن کی دیاڑی اری گئی تھی اور ان مریضوں کا جو ہسپتال نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہ بار بار تھرموس سے پانی پی رہی تھی۔ مگر چھوٹا تھک کر اب اونگھ رہا تھا مجھے خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت ہوائی جہاز سے شہر کا نظارہ کیا جائے تو کیسا خوفناک منظر دکھائی دے۔ ایسا معلوم ہو جیسے سارا شہر ساکت و جامد ہو گیا ہے۔

ہم نے ای ریڑھی والے سے پھل خریدا پھر ڈرائیور سے کہہ کر قریبی ریستوران سے چائے منگائی مگر تھکاوٹ اور بوریت کم نہ ہوئی البتہ جس طرح رنج سے خوگر ہونے سے رنج کا احساس مٹ جاتا ہے اس طرح وہ مسلسل مضطرب رہنے کے بعد اب قدرے پر سکون ہو گئی تھی اس دوران ہم نے کئی بار سامان اٹھا کر پیدل گھر واپس جانے کا ارادہ کیا مگر ایک تو فاصلہ بہت تھا دوسرے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ٹریفک میں ہلچل پیدا ہو جاتی اور امید بندھ جاتی کہ شاید اب ٹریفک رواں ہونے والا ہے۔

پھر ہمارے قریب کھڑی منی بس کے ڈرائیور کا کوئی جاننے والا بڑے چوک کی طرف سے پیدل چلتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ سڑک جلد ہی صاف ہو جائے گی اور ٹریفک حرکت میں آ جائے گا۔

''چکر کیا تھا بھائی؟''

''کوئی خاص بات نہیں تھی استاد۔۔۔۔۔۔۔بس ایک شخص نے ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زبردستی اپنی گاڑی آگے بڑھادی دوسری طرف سے گاڑیاں پہلے ہی آگے بڑھ چکی تھیں اسے ریورس کرنے کو کہا گیا مگر اس نے ایک نہ سنی اور جب تک ٹریفک پولیس مداخلت کرتی ریورس کرنا ناممکن ہوگیا تھا کیوں کہ ہر طرف گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ چکی تھیں۔

''کمال ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔''صرف ایک شخص کی وجہ سے سارے شہر کا ٹریفک جام ہوگیا۔''

''ہر واقعہ کا محرک کوئی ایک شخص ہی ہوتا ہے۔وہ آگے ہوتا ہے یا اگلی صف میں ہوتا ہے۔اسی سے پہل ہوتی ہے۔''

''ایسے شخص کو سخت سزا ملنی چاہئے جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔''

''ابو'' چھوٹا پچھلی سیٹ پر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔اور بولا ''ہم تو وہیں ہیں جہاں صبح تھے۔''

''ہاں بیٹا'' وہ بولی ''جہاں اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔کوئی بھی کہیں نہیں پہنچ سکتا یا سب کو دیر ہو جاتی ہے۔''

اچانک ٹریفک میں پھر ہلچل پیدا ہوگئی۔ایک بار پھر انجن سٹارٹ ہو گئے۔ہارن بجنے لگے اور ٹریفک پولیس کے سپاہیوں کی وسلیں سنائی دینے لگیں اور ہم آخری ٹرین پکڑنے کی امید میں ایک بار پھر بیتابی سے ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔

◆◆◆

ایندھن

اس کا ذہن بیدار ہوتا ہے تو وہ یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ زندگی اور موت میں بس یہی فرق ہے کہ آدمی سوچ سکتا ہے یا نہیں سوچ سکتا۔ وہ آنکھیں کھولنا چاہتا ہے مگر پپوٹوں پر بوجھ محسوس ہوتا ہے اور کوشش کے باوجود آنکھیں نہیں کھلتیں ۔۔۔۔۔۔تاہم اسے یہ جان اور محسوس کر کے کہ اس کی آنکھیں اس کے ساتھ اور سلامت ہیں اطمینان ہوتا ہے۔ کان لگا کر سنتا ہے۔ اپنے سانس کے چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باری باری دونوں بازوؤں کو حرکت دیتا اور جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے بازو سلامت ہیں ۔ اس کا مطلب ہے اوپر کا دھڑ جس میں بازو لگے ہیں اب تک موجود ہے مگر نچلا دھڑ۔۔۔۔۔۔۔؟ کوشش کے باوجود اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے یاد آتا ہے آخری بار جب دھماکے کی آواز اس کے کانوں میں آئی تھی اس کے ساتھ ہی کوئی چیز اس کے اندر پیوست ہو گئی تھی اور وہ ہوا میں اچھلا یا شاید پاتال میں گرتا چلا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آخری خکال اپنے مرنے کا آیا تھا اور اس نے بغیر کسی رنج اور خدشے کے سوچا تھا کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اسے مطلق خیال نہیں تھا کہ وہ کیوں اور کس کے ہاتھوں مر رہا ہے اسے اپنا کوئی دوست یا رشتہ دار بھی یاد نہیں آیا تھا یا شاید اس کی فرصت اور مہلت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی کو یاد کر سکتا۔ اسے نہیں معلوم کہ مرنے کے خیال اور زندہ ہونے کے احساس کے درمیان وقت نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا۔ اسے یاد آتا ہے ت شاید سہ پہر کا وقت تھا۔ دھماکوں اور پرندوں کی آوازوں کا شور فضا میں پھیلا ہوا تھا اور اگرچہ روشنی تھی مگر دھوئیں اور بلند قامت درختوں کے سایوں کی وجہ سے زیادہ دور کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں اور گھنے جنگل اور پہاڑوں نے ابھی سے دھوپ اور روشنی کا راستہ روک دیا تھا مگر اب اس کے مقابلے میں ہر طرف خاموشی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی جانور کے بولنے کی آواز سنائی دیتی یقیناً رات ہو چکی ہو گی اور عارضی طور پر لڑائی رکی ہوئی ہو گی۔

اچانک اس کے پاؤں میں درد کی لہر اٹھتی ہے اور ہو خوش ہوتا ہے کہ اس کا پاؤں بھی موجود ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے پورے جسم کو محسوس کرنے لگتا ہے یہ بائیں ٹانگ اور پاؤں۔ یہ دایاں گھٹنا اور یہ۔۔۔۔۔۔۔ اس کی کنپٹی میں سوئے ہوئے درد کی ٹیس جاگتی ہے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے ٹٹولتا ہے۔ کنپٹی پر گہرا زخم ہے وہ گھبرا کر اور چونک کر آنکھیں کھول دیتا ہے۔

اس کی آنکھیں چوپٹ کھلی ہیں مگر اسے کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تو کیا اس کی بصارت؟ مگر نہیں آنکھیں سلامت ہیں اور ان

میں درد ہے نہ جلن۔شاید تاریکی بہت ہے اندھیرا زیادہ ہوتو آنکھیں سلامت ہوں تب بھی کچھ نظر نہیں آتا۔یقیناً اماوس کی رات ہوگی کیا پتہ آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوں یا وہ کسی تاریک اور گہرے گڑھے میں پڑا ہو!

اسے یاد آتا ہے۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر بہت سے گڑھے کھودے تھے۔تو کیا وہ اپنے ہی کھودے ہوئے کسی گڑھے میں گر گیا؟ لیکن یہ تو دشمن کے لئے کھودے گئے تھے۔کیا پتہ یہ دشمن کا کھودا ہوا کوئی گڑھا ہو وہ بھی تو اپنے دشمن کے لئے کئی روز سے کھودر ہے تھے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ گڑھا کس نے کھودا۔جب آدمی کھودرہا ہوتا ہے اسے پتہ نہیں ہوتا کہ وہ دراصل کس کے لئے کھودرہا ہے اسے تو بسا اوقات یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں کھودرہا ہے۔اصل سوال تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے لئے گڑھا کیوں کھودتا ہے۔وہ کسی دوسرے کو ہلاک کرنا کیوں چاہتا ہے اور اسے اپنے جیسے دوسروں سے خطرہ کیوں ہے مگر اس وقت شاید اہم سوال یہ ہے کہ اگر یہ گڑھا ہے چاہے دشمن کا کھودا ہوا یا اپنا' اس سے باہر کیسے نکلا جائے اور اگر اس علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے تو باہر نکل کر کیا کیا جائے۔اسے خیال آتا ہے کہ جب تک روشنی نہ ہو جس میں دوست اور دشمن کی تمیز ہو سکے' گڑھے سے باہر نہیں نکلنا چاہئے مگر اس کا تو کوئی دوست یا دشمن نہیں البتہ اس کی بندوق سے گولیاں نکلتی رہی ہیں کیا پتہ کس کو کوئی لگ گئی اور وہ مر گیا ہو یا اسی کی طرح کسی گڑھے میں پڑا کراہ رہا ہو۔اسے خوف سا آنے لگتا ہے۔اگر ایسا ہوا ہے تو وہ خود کو کیا جواب دے گا؟ اچانک روشنی کی ایک لکیر سی اس کی نگاہوں کے سامنے جھلملاتی ہے مگر دوسرے ہی لمحے پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ واقعی ایک گہرے کھڈ میں پڑا ہے جس کے کنارے اونچے ہیں اور اس کے آس پاس کوئی موجود ہے۔شاید دشمن کے آدمی؟ ممکن ہے دشمن اپنے آدمیوں کی لاشیں اٹھا رہا ہو مگر کیا پتہ دشمن کی بجائے یہ اپنے کسی آدمی کی ٹارچ کی روشنی ہو۔کتنی عجیب بات ہے کہ روشنی سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ دشمن کی ٹارچ سے نکلی ہے یا دوست کی۔یہی صورت گولی کی ہے۔دوست اور دشمن اور قصوروار اور بے قصور میں تمیز نہیں کرتی۔آپ دشمن کی بندوق چھین کر اسی سے اس کو ہلاک کر سکتے ہیں۔پتہ نہیں جہاں گولیاں بنتی ہیں وہاں کسی کو خیال آتا ہو کہ ان گولیوں سے کون اور کیسے لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں کتنے خواب ویرانا ہو سکتے ہیں اور کتنے بچے یتیم ہو سکتے ہیں۔شاید ہی کبھی کسی نے کوئی گولی ہاتھ میں لے کر اس شخص کو تصور کیا ہو جس کے سینے' دل یا دماغ میں وہ پیوست ہونے والی ہوتی ہے۔خود چلانے والے کو اکثر پتہ نہیں ہوتا کہ وہ جسے ہلاک کر رہا ہے وہ کون اور کیسا ہے۔اس کا نام کیا ہے عمر کتنی ہے۔شکل وصورت کیسی ہے اور اسے زندہ رہنے کی کتنی خواہش اور ضرورت ہے۔اسے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دشمن کی صف کا آدمی ہے اور بس۔اسے تو بسا اوقات دشمنی کا حساب بھی معلوم

نہیں ہوتا۔ اسے حکم ملتا ہے اور فائر کھول دیتا ہے اور نہیں جانتا وہ گولیاں کسی کو لگ بھی رہیں ہیں یا نہیں۔ اور اگر لگ رہی ہیں تو کس کس کو اور کہاں کہاں اور ان پر کیا بیت رہی ہے اگر وہ ان سب کو جنہیں وہ ہلاک کر رہا ہوتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہو ان کے نجی حالات، مجبوریوں، آرزوؤں اور خوابوں سے واقف ہو تو شاید گولی چلانے میں تامل کرے مگر نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے حکم کی تعمیل تو بہر حال کرنا ہوتی ہے اسی کا نام ڈسپلن ہے اور اسی کی تربیت دی جاتی ہے تو قصوروار کون ہے! حکم دینے والا یا تعمیل کرنے والا۔ وہ جس قدر سوچتا ہے، اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہے۔ پھر اسے پاؤں کی ٹیس اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور ٹٹول کر پاؤں کے زخم کو چھوتا اور اندر سے گولی نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ درد کی شدت سے اسے چکر آنے لگتے ہیں وہ خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر نہیں سنبھال سکتا۔

کیا دیکھتا ہے ایک چبوترے پر اسٹیج بنا ہے جس کے سامنے تماشائی بیٹھ ہیں۔ بائیں جانب وردی میں ملبوس ایک افسر ہاتھ میں ڈنڈا لئے کرسی پر بیٹھا ہے۔ حوالدار سلیوٹ مارتا ہے۔ افسر پوچھتا ہے:

”کیا خبر ہے؟“

”سر دشمن نے پھر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے بہت سے آدمی کام آ گئے ہیں ہمیں مزید آدمیوں کی فوری ضرورت ہے۔“

”نئی بھرتی کا کیا ہوا؟“

”جاری ہے سر لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”جوان آدمی نہیں ملتے تو بوڑھوں کو بھرتی کرو۔ سکولوں میں جاؤ۔“

”سر تقریباً تمام صحت مند بوڑھوں کو بھرتی کیا جا چکا ہے اور انہیں ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ سکولوں کے اعلیٰ درجوں کو بھی بھرتی کر لیا گیا ہے۔“

”یہ اعلیٰ اور ادنیٰ کیا بکواس ہے۔“

”سر میرا مطلب ہے کم از کم بندوق تو اٹھا سکتے ہوں۔“

”چھوٹی بندوقوں کا آرڈر دے دو منی گنز۔ انڈرسٹینڈ“

”یس سر“

''اور یہ کون ہے؟'' افسر اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے۔

''سر یہ وہی آدمی ہے جو سکول کے بچوں کو روکتا اور خود بھی رضامند نہیں ہوتا۔''

''رضامندی ضروری نہیں ہے۔''

''سر رضامندی کے بغیر۔۔۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے تعاون تو ضروری ہے ورنہ کیا فائدہ۔''

''دشمن سے ملا ہوا ہے؟''

''نہیں سر ہم نے انوسٹیگیٹ کر لیا ہے اس کے مغز میں خرابی معلوم ہوتی ہے۔''

''اسے ٹریننگ دے کر محاذ پر بھجوا دیا جائے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''حضور میں لڑنا نہیں چاہتا۔'' وہ کہتا ہے ''مجھے لڑائی جھگڑے سے وحشت ہوتی ہے۔ میں کسی کا خون کرنا نہیں چاہتا میں نے آج تک کسی کی جان نہیں لی صرف ایک بار مرغی ذبح کی تھی اس کا تڑپنا اور پھڑکنا مجھے آج تک نہیں بھولا۔''

افسر ہنستا ہے اور دلچسپی لیتے ہوئے کہتا ہے۔

''آدمی اتنا بزدل بھی ہو سکتا ہے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔''

''میں بزدل نہیں مہذب آدمی ہوں۔''

''مہذب یا احمق؟'' افسر قہقہہ لگاتا ہے۔

''میرا ایک اور مسئلہ بھی ہے حضور؟''

''کیا مسئلہ ہے؟''

''میرے سامنے کوئی غلط کام کیا جائے کسی سے زیادتی یا بے انصافی کی جائے تو خود بخود میری نکسیر پھوٹ جاتی ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے حوالدار؟''

''یہ ٹھیک کہتا ہے سر۔ بہت کمزور دل کا آدمی ہے اس کے سامنے کوئی ایسا کام کیا جائے جو اسے پسند نہ ہو تو اس کی نکسیر پھوٹ جاتی ہے اور خون زیادہ بہہ جائے تو یہ بکری کا بچہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔''

''سچ سچ بتا دو تم کون اور اصل بات کیا ہے۔'' افسر پوچھتا ہے۔

''میں ایک امن پسند شہری ہوں۔ بچوں کو پڑھاتا ہوں اور پڑھانا چاہتا ہوں۔ میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں اور بچوں کو اس کا

ایندھن بنتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا اپنی سرزمین کا دفاع کرنا میرا تمہارا ہم سب کا فرض نہیں ہے؟"

"میرا کام بچوں کو پڑھانا اور انہیں اچھا شہری بنانا ہے۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ دشمن تمہارے سکول کو آگ لگا سکتا اور تمام بچوں کو ہلاک کر سکتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ دشمن ہے۔"

"دشمن دشمن کیوں ہے؟"

"یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے اور نہ تمہاری کھوپڑی میں یہ بات آ سکتی ہے۔"

"کیا میرا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے اور وہ بھی جانے بوجھے بغیر؟"

"ہاں یہی ہمارا فیصلہ ہے۔"

"میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔"

"""تمہیں حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔"

"میں گولی نہیں چلا سکتا۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں کسی سے زیادتی کروں تو وہ کیفیت خود مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔"

"کیا بکتے ہو؟"

"میں سچ کہتا ہوں۔ ایک دفعہ بچپن میں، میں خرگوش کا شکار کرنے والے شکاریوں اور کتوں کے ہمراہ گیا تھا۔ وہ منظر مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ خرگوش میں خود تھا۔ میں پورے طاقت سے بھاگ رہا تھا مگر کتوں کی تھوتھنیاں ہر لمحے میرے قریب تر آتی جا رہی تھیں اس وقت بے بسی کی جو کیفیت میں نے محسوس کی تھی وہ اذیت میری روح کا حصہ بن گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے میدان جنگ میں کسی کو ہلاک ہوتے دیکھ لیا تو مر جاؤں گا۔"

"ابھی تمہارا امتحان لیتے ہیں۔" افسر کہتا ہے پھر حوالدار سے مخاطب ہوتا ہے۔

"حوالدار"

"یس سر۔"

''ایک بے قصور آدمی تلاش کرو۔ اور اسے اس کے سامنے کوڑے لگاؤ۔''

''ویری ویل سر۔'' حوالدار ادھر ادھر دیکھتا ہے پھر اسٹیج سے اتر کر تماشائیوں کے پاس آتا ہیاور باری باری ہر ایک کے پاس جاتا ہے۔ اپنی باری پر ہر تماشائی اپنی نشست سے کھڑا ہوتا اپنے جرم اور گناہ کا اعتراف کرتا اور اس کی نوعیت بتاتا ہے:

نمبر ایک: میں جیب کترا ہوں۔

نمبر دو: بردہ فروش۔

نمبر تین: قاتل۔

نمبر چار: چوری ڈکیتی' رسہ گیری۔

نمبر پانچ: پڑوسی کے کم سن بچے سے بدفعلی۔

نمبر چھ: ناپ تول میں ڈنڈی مارتا ہوں۔

نمبر سات: ملاوٹ' ذخیرہ اندوزی' سود خوری۔

نمبر آٹھ: قمار بازی۔

نمبر نو: اپنے مزارعوں اور ہاریوں کو پورا حصہ نہیں دیتا۔

نمبر دس: میں بہت ہی برا آدمی ہوں اپنی سگی بھانجی۔۔۔۔۔۔۔

نمبر گیارہ: امانت میں خیانت

نمبر بارہ: میں پنچائت کا رکن ہوں۔ میں نے کئی بار غلط فیصلوں کی تائید کی ہے۔

نمبر تیرہ: رشوت' غبن۔

نمبر چودہ: جھوٹی گواہی۔

نمبر پندرہ: میں نے اپنے دوست کی بیوی سے جو مجھے بھائی سمجھتی اور مجھ پر اعتماد کرتی تھی زبردستی کی۔

نمبر سولہ: سمگلنگ۔

نمبر سترہ: عورتوں اور منشیات کا اڈہ چلاتا ہوں۔

نمبر اٹھارہ: مزدور کی تنخواہوں سے اپنا کمیشن کاٹتا ہوں۔

نمبر انیس: میں خدا کے ساتھ دھوکا کرتا ہوں۔ مجھے عبادت کے مخصوص اور اصل الفاظ بھول گئے ہیں مگر میں ایک عرصہ سے عبادت کی اداکاری کرر ہا ہوں۔

نمبر بیس: مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔

نمبر اکیس: حضور میں ایک حاس آدمی ہوں کسی کی خوش نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے تصور میں کئی لوگوں کو قتل کیا ہے اور میری سازشوں سے کئی لوگوں کو نقصان پہنچ چکا ہے۔

نمبر بائیس: جناب میں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا البتہ میں سچ کو چھپاتا اور اس کا بروقت اظہار کرنے سے ہچکچاتا رہا ہوں۔

نمبر تئیس: میں تو بہت ہی گناہگار ہوں حضور: میں علم کے نام پر جہالت اور تعصب کا پرچار کرتا رہا ہوں۔

''حوالدار مایوس ہو کر واپس پلٹتا ہے اور کہتا ہے۔

''سر یہ سارا ہال ایسے ہی لوگوں سے پٹا پڑا ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی کی پتلون؟''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' افسر کہتا ہے۔ جس نے جو جرم کیا ہے اس سے اس کے علاوہ کسی دوسرے جوم میں پکڑ کر سزا دو۔''

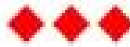
''ویرہ گڈ۔۔۔۔۔۔۔ سر یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اس کی ناک سے خون بہنے لگتا ہے۔ قمیص کا سامنے کا حصہ سرخ ہو جاتا ہے مگر اسی لمحے کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ صبح کا اجالا پھیل رہا ہے۔ گڑھے کے اوپر سے دکھائی دیتا آسمان کا ٹکڑا ابر آلود ہے۔ وہ اوپر دیکھتا رہنا چاہتا ہے مگر اسے ڈر لگتا ہے کہیں دشمن کا کوئی آدمی اچانک کنارے پر آ کر کھڑا نہ ہو جائے اور اس کی زندہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اسے گولی سے نہ اڑا دے۔ مگر جب کافی دیر تک کوئی آہٹ سنائی نہیں دیتی تو وہ دوبارہ آنکھیں کھول کر اوپر دیکھنے لگتا ہے۔ اسے خواب یاد آتا ہے اور وہ ٹٹول کر دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے اس کے نتھنوں کے سامنے والی خون کی پیڑیاں جمی ہوئی ہیں پھر کنپٹی اور پاؤں میں درد کی ٹیسیں جاگتی ہیں اور وہ کراہنے لگتا ہے۔ اسی لمحے درخت کی اس شاخ پر جو اسے لیٹے لیٹے نظر آ رہی ہے، رنگین پروں والی ایک خوبصورت چڑیا آ کر بیٹھ جاتی اور صبح کی تازہ ہوا کے جھونکوں میں شاخ کا جھولا جھولنے لگتی ہے۔ اسے چڑیا پر رشک آتا ہے۔ کم از کم اسے زبردستی کسی جنگ میں لڑنے کے لئے بھرتی نہیں کیا جا سکتا مگر اسے یاد آتا ہے۔ کل جب جنگ زوروں پر تھی۔ دھماکوں سے پرندے کس قدر پریشان تھے۔ یقیناً وہ دانہ دنکا بھی نہیں چگ سکی ہوگی۔ پھر اسے مہلک کیمیائی اور ایٹمی ہتھیاروں اور بموں کا خیال آتا ہے جن کے پھٹنے سے ہر قسم کی حیوانی اور نباتاتی زندگی بھی بھسم ہو سکتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ سائنسدانوں نے ایسے بم ایجاد کر

لئے ہیں جن کے پھٹنے سے ساری ہوا مسموم ہو جائے گی اور ہر ذی روح کا دم گھٹ جائے گا اور انسان ہی نہیں تمام چرند پرند بھی فوراً ہی مر جائیں گے۔ معصوم اور بے خطا چرند پرند۔ دم گھٹنے کے خیال سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا مگر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا جاتا ہے پھر اس اندھیرے سے عجیب سا منظر ابھرتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ میچ شروع ہو چکا ہے۔

نیلی اور پیلی یونیفارم پہنے دونوں ٹیموں کے کھلاڑی فٹ بال کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ وہ منہ میں وسل کے لئے ساتھ بھاگ رہا ہے۔ فٹ بال کبھی ایک طرف کی ڈی میں چلی جاتی ہے کبھی دوسری میں۔ نیلی یونیفارم میں اس کی اپنی کلاس کے بچے بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن اچانک فٹ بال کو چھوڑ کر دونوں ٹیمیں ایک دوسری پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ وہ بار بار وسل بجاتا ہے مگر وہ الگ نہیں ہوتے ایک دوسرے کو ناخنوں سے نوچتے اور دانتوں سے کاٹتے اور بھنبھوڑتے ہیں وہ انہیں قریب آ کر منع کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ باؤلے پلوں کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور اس کی ایک نہیں سنتے۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ پیلی یونیفارم میں بھی اس کی اپنی کلاس کے وہی بچے ہیں جو نیلی یونیفارم میں ہیں۔ یونیفارم کے رنگ کے علاوہ ان میں کوئی فرق نہیں اور وہ اپنے اپنے ہم شکلوں کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ صدمے اور دہشت سے اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھتا ہے مگر گڑھے کے کناروں پر لرزتے ہوئے سائے دیکھ کر سہم جاتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ کرے اسے اوپر دیکھتے رہنا چاہئے یا آنکھیں بند کر لینی چاہئیں، کون سی دعا پڑھنی اور کسے یاد کرنا چاہئے تڑتڑتڑ کی مسلسل آواز سے سارے پنچھی یکبارگی اڑتے ہیں اور ان کی چیخ پکار سے سارا جنگل گونجنے لگتا ہے۔



خوف85ء

دستک کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر جاگتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ بیوی بستر پر موجود نہیں مگر پھر باورچی خانے سے برتنوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ نیچے جانا چاہتا ہے مگر اسے ملحقہ کمرے میں سوئے ہوئے بچوں کا خیال آ جاتا ہے اور اس کا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگتا ہے جلدی سے پلٹ کر بچوں کے کمرے میں آتا اور دروازہ کھول کر دیکھتا ہے۔ بچے سو رہے ہیں بظاہر سب کچھ ٹھیک لگتا ہے پھر بھی وہ قریب جا کر جائزہ لیتا اور اطمینان کر لینا چاہتا ہے کہ کسی تکیے یا بستر پر خون کا کوئی چھینٹا تو نہیں۔

''نماز کا وقت ہو گیا بیٹے۔'' ابا کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''آ رہا ہوں۔'' وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ ''آپ چلیں ابا جی۔'' وضو کر کے وہ مسجد چلا جاتا ہے۔ مسجد میں بھی لوگ خوفزدہ اور سہمے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اور چہرے بتا رہے ہیں کہ وہ بالکل یا پوری طرح سو نہیں سکے ہیں مولوی صاحب دعا میں اللہ تعالیٰ سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ رزق حلال' جذبہ جہاد' ایمان کی طاقت' بیماروں کے لئے شفا' نیکیوں کی توفیق اور حوض کوثر کا جام' مگر جب وہ مرتے وقت کلمہ نصیب ہونے کی دعا مانگتے ہیں' اسے جھری جھری سی آ جاتی ہے کہ سوتے میں کند آلے سے ہلاک ہو جائے پر تو آدمی کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اسے اپنی مرحومہ ماں کی نصیحت یاد آتی ہے جو سونے سے پہلے آیۃ الکرسی اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی تاکید کیا کرتی تھیں۔

ابا کے ہمراہ مسجد سے واپسی پر دروازے کے پاس اخبار پڑا ملتا ہے وہ اٹھا کر دیکھتا ہے اور جلدی سے بند کر دیتا ہے اس کا جی چاہتا ہے اخبار کو کہیں چھپا دے مگر ابا اس سے اخبار لے لیتے ہیں اور وہیں کھڑے ہو کر سرخیاں دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ بھاری بھاری قدموں سے اندر چلا جاتا ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی چٹخنی کمزور ہے اور اسے دھکا لگا کر آسانی سیکھولا یا توڑا جا سکتا ہے پھر اس کی نظر کھڑکیوں اور روشندانوں پر پڑتی ہے اور اسے پہلی بار پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے غیر محفوظ مکان میں رہتا ہے۔ افسوس مکان بناتے وقت ابا نے ان باتوں کا خیال نہ رکھا۔ ناشتے کی میز پر وہ ان سے اس کی شکایت کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں:

''سبھی لوگوں کے مکان ایسے ہیں' ایسے ہی ہوتے ہیں مکان قلعہ تو نہیں ہوتا اور پھر بیٹے گھسنے والے تو قلعوں میں بھی گھس جاتے ہیں

بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرو وہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔"

دفتر میں ہیڈ کلرک مختلف فائلوں پر اس کے دستخط کرواتے ہوئے کہتا ہے:

"لوگ بہت زیادہ خوفزدہ ہیں سر۔ شام کو میرے بیوی بچے مجھے گھر سے نہیں نکلنے دیتے انہیں بہت ڈر لگتا ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں البتہ احتیاط ضروری ہے۔"

"وہ تو ہم کر رہے ہیں مگر بجلی چلی جائے یا بے وقت کوئی دروازے پر دستک دے تو بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمام گھر والوں کو تاکید کی ہوئی ہے کہ رات کو دستک ہو تو بغیر پوچھے اور دیکھے بھالے دروازہ نہ کھولیں۔ پرسوں رات میری بیوی کا بھانجا رات کی گاڑی سے اچانک آ گیا اس نے دستک دی تو سب جاگ گئے گھر میں کہرام مچ گیا۔"

"ہاں لوگ بہت خوفزدہ ہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے اس سے جرائم پیشہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"سر لوگ بے چارے کیا کریں۔ وہ اپنا فضل الرحمن اسسٹنٹ ہے نا! اس نے ایک صبح دروازہ کھولا تو ایک بوری دروازے کے باہر پڑی تھی جس میں ایک ہتھوڑا رکھا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر اس نے پولیس کو اطلاع دی اب پولیس اس کے گھر کی نگرانی کرتی ہے اس کے باوجود گھر اور محلے کے سب لوگ جاگ کر رات گزارتے ہیں اور ذرا کہیں کھٹکا ہو جائے تو ہڑ بونگ مچ جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔" وہ ہیڈ کلرک کو تسلی دیتا ہے۔ "تم سیٹھو کو میرے پاس بھیج دو۔"

"اس کی تو چھٹی کی درخواست آئی ہے۔"

"کیوں؟"

"اپنے گاؤں چلا گیا ہے مکان مرمت کرانے۔ کل بتا رہا تھا کہ اس کے والدین اور بہنیں جس مکان میں رہتے ہیں اس کی چار دیواری کچی ہے۔"

"تو کیا پختہ کر لینے سے محفوظ ہو جائے گی؟"

"بس سر ایک تسلی تو ہو جاتی ہے دل کو۔"

"ہاں یہ بھی ضروری ہے آدمی کو اندر سے مضبوط رہنا چاہئے۔"

''اچھا تو غلام مرتضٰی کو بلا دو۔''

''سر وہ دیر سے آئے گا۔''

''کیوں؟''

''رات کو محلے میں باری باری پہرا دینا پڑتا ہے۔ رات اس کی باری تھی ظاہر ہے اب سو رہا ہو گا کہتا تھا دو پہر سے پہلے پہلے آ جاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ ہیڈ کلرک کو رخصت کر کے ٹیلی فون ملاتا ہے۔

''اسلم بھائی وہ سٹریٹ لائٹس ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئیں۔ میری نوکری کا مسئلہ ہے۔''

''میری بھی نوکری کا مسئلہ ہے۔'' اسلم جواب دیتا ہے۔'' آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ نئی اور پرانی سٹریٹ لائٹس کی کتنی شکایتیں اور سفارشیں ہیں میرے پاس آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ کتنے لوگوں کی اپیلیں ہر روز چھپ رہی ہیں کہ ان کے علاقے میں روشنی کا بندوبست کیا جائے۔ ہم برسوں سے گلیوں کی تاریکی دور کرنے کے تخمینے بھیج رہے تھے مگر منظوری نہیں ملتی تھی اب بھی بڑی مشکلات ہیں۔''

''یار اس کا تو کچھ کرو میرے باس کا گھر ہے۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔ لیکن میں خود بہت پریشان ہوں۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''ہمارے مکان پر کسی نے نشان لگا دیا ہے۔''

''کس قسم کا نشان؟''

''پتہ نہیں بس کل صبح باہر نکلا تو دیکھا دروازے کے پاس چاک سے پراسرار سا نشان لگا ہوا تھا۔ اب کل سے پولیس کا پہرا ہے۔''

''یار کسی بچے کی شرارت ہو گی۔''

''شرارت تو یقیناً ہو گی مگر کسی بچے کی نہیں خاصی اونچی جگہ پر نشان لگا ہوا تھا۔ تمہاری بھابی بہت پریشان ہے کہتی ہے فوراً مکان تبدیل کرو۔''

''بھابی کو سمجھائیں زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

''ہاں بھئی بہت سمجھایا مگر وہ کہتی ہے۔ کلہاڑے اور ہتھوڑے تو نافرمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔''

''ہاں مگر جس کی آئی ہوتی ہے وہی شکار ہوتا ہے۔''

''جناب جس کے سر پر ہتھوڑا یا کلہاڑا لگ جاتا ہے اسی کی آ جاتی ہے۔''

''تم بہک رہے ہو کفر کے کلمے مت بولو اللہ رحم کرے گا۔''

''ہاں بار بس دعا کرو۔ اچھا خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

دفتر سے واپسی پر ویگن میں سوار ہوتا ہے۔ چار چار کی سیٹوں پر چھ چھ مسافر ایک دوسرے میں دھنسے بیٹھے ہیں۔

''مجھے تو یہ کوئی بہت بڑا چکر معلوم ہوتا ہے۔'' ایک کہتا ہے۔

''بھائی تمہارے علاقے میں تو سنا ہے پولیس رات کو گشت کرتی ہے۔'' دوسرا کہتا ہے۔

''ہاں اسی لئے تو ہم زیادہ خطرے میں ہیں۔'' پہلا قہقہہ لگاتا ہے۔

''آہستہ ہنسئے جناب۔''

''کیوں پابندی لگ گئی ہے؟''

''نہیں آپ کے ہنسنے سے میری پسلی میں درد ہوتا ہے۔''

''آخر پولیس اس قدر بے بس کیوں نظر آتی ہے؟'' پیچھے سے آواز آتی ہے۔

''آپ کو پولیس کے نظر آنے پر اعتراض ہے یا اس کی بے بسی پر؟''

''ہوسکتا ہے انہیں سب کچھ معلوم ہو کسی مجبوری یا مصلحت کی بنا پر فی الحال ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔''

''جی ہاں ممکن ہے اس سے اور زیادہ دہشت پھیلنے کا ڈر ہو۔''

''ویسے خاصے تربیت یافتہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی مہارت سے واردات کرتے ہیں کوئی نشانی نہیں چھوڑتے۔''

''جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں انجام کیا ہوگا۔''

''جرائم بہت بڑھ گئے ہیں صاحب۔''

''جی ہاں یہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی بڑی واردات کے سائے میں سانس لے رہے ہیں۔''

"اللہ اپنا رحم کرے۔"

"کیوں بھائی صاحب آپ کے محلے میں بھی ٹھیکری پہرہ ہے؟"

"جی ہاں ہے تو سہی مگر روشنی کا کوئی بندوبست نہیں بڑا اندھیرا ہے۔"

ویگن سٹاپ سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر ہارڈ ویئر کی دکان پر پڑتی ہے۔ وہ چٹخنیاں خریدنے کے لئے رک جاتا ہے۔ اس لمحے دکان میں کھڑا ایک مضبوط جسم کا میلا کچیلا آدمی ہتھوڑا اٹھا کر اس کی قیمت دریافت کرتا ہے۔ اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں ہتھوڑا پسند کرنے اور وزن کرا کے پیسے ادا کرنے میں چند منٹ لگتے ہیں مگر اتنی دیر میں دکان کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ بھیڑ کو دیکھ کر راشتہ چلتے مزید لوگ جمع ہو جاتے ہیں پر پولیس کے آدمی کو بلا لیا جاتا ہے۔

"کون ہو تم؟" سپاہی پوچھتا ہے "اور ہتھوڑا کیوں خرید رہے ہو؟"

ہتھوڑا خریدنے والا پریشان ہو کر ہجوم کی طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے۔

"میں مستری ہوں کنکریٹ توڑنے کے لئے مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"کنکریٹ توڑنے کے لئے یا۔۔۔۔۔۔۔؟" سپاہی کہتا ہے "تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔"

"مگر کیوں؟" مستری کہتا ہے۔ "کیا ہتھوڑا خریدنا جرم ہے؟"

"اس کا تمہیں وہیں پتہ چلے گا۔"

"جناب میں نیا نیا آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب ہتھوڑا خریدنے کے لئے پرمٹ لائسنس حاصل کرنا پڑتا ہے۔"

"زیادہ بک بک نہ کرو۔ ابھی سب پتہ چل جائے گا چلو۔"

سپاہی اسے ساتھ لے کر جاتا ہے لوگوں کا ایک ہجوم ان کے ہمراہ چلتا ہے۔

وہ چٹخنیاں خرید کر گھر کا رخ کرتا ہے۔ کھانا کھا کر آرام کرنا چاہتا ہے مگر اس کا پڑوسی دوست محمد آ جاتا ہے۔

"میں نے اسلحہ لائسنس کے لئے درخواست دی تھی۔ وہ کہتے ہیں اپنے پڑوسیوں سے تصدیق کرا کر لاؤ۔"

"کس بات کی تصدیق؟"

"یہ کہ ان سے میرے تعلقات اچھے ہیں اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

وہ دوست محمد کے کاغذات پر دستخط کر دیتا ہے۔ دوست محمد شکریہ ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ تو اسے ایک برا سا خیال آتا ہے کہ نہ

جانے کب دوست محمد سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔"

شام کو صدیقی آ جاتا ہے۔ چائے کا دور چلتا ہے۔ خوب گپ شپ ہوتی ہے۔ پھر صدیقی کہتا ہے۔

"یار راستے میں ایک شخص نجو کسی جسمانی تکلیف میں مبتلا معلوم ہوتا تھا مجھ سے لفٹ مانگی مگر میں نے موجودہ حالات کے پیش نظر اجنبیوں کو لفٹ دینا چھوڑ دیا ہے۔ پتہ نہیں کون کیسا ہو مگر اب مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا ہے۔"

"افسوس سے احتیاط بہتر ہے۔"

"پرسوں میں جی پی او سے نکلا۔" صدیقی کہتا ہے "تو ایک خوبصورت اور جوان لڑکی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ یار بڑی حسرت رہتی تھی کسی ایسے بھولے بھٹکے مسافر کو منزل پر پہنچانے کی مگر دل پر جبر کرنا پڑا۔"

"چھوڑو یار۔۔۔۔۔۔۔اب عورتوں سے بھی ڈرنے لگے ہو۔"

"عورتوں سے کیا لوگ تو اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے ہیں اور پھر واقعہ تمہیں یاد ہے ہائی وے والا؟"

"کون سا؟"

"وہ جو ایک عورت اور اس کے ساتھ پکڑے گئے تھے وہ لفٹ لے کر سوار ہو جاتی تھی پھر اس کے ساتھ کار میں تعاقب کر کے لفٹ دینے والے کو بلیک میل کرتے اور لوٹ لیتے تھے۔" اچانک صدیقی کی نظر گھڑی پر پڑتی ہے اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

"یار دیر ہو گئی مجھے ایک اور جگہ ضروری پہنچنا ہے۔ پھر ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔"

رات کو سونے سے پہلے وہ تمام کھڑکیوں اور دروازوں کی نئی پرانی چٹخنیاں اور کنڈیاں خود بند کرتا ہے۔ گھر میں اچھی طرح گھوم پھر کر اطمینان کرتا ہے کہ تمام روشندان بند ہیں۔ اس کے باوجود اس کی تشفی نہیں ہوتی اسے کھڑکیاں' دروازے اور روشندان نہایت کمزور اور بوسیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ پکی دیواریں گارے کی بنی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ سنگ و خشت کے گھر میں نہیں گتے سے بنائے گئے مکان میں رہ رہا ہو۔ بستر پر دراز ہوتے وقت اچانک اس کی نظر الماری کے اوپر رکھے ہیلمیٹ پر پڑتی ہے جو اس نے ان دنوں خریدا تھا' جب اس کے پاس سکوٹر تھی۔ اس کا جی چاہتا ہے وہ ہیلمٹ پہن کر سوئے مگر پھر اسے اپنی اس بزدلانہ اور خودغرضانہ سوچ پر ہنسی آ جاتی ہے۔

اگلی صبح وہ دستک سے پہلے خود بخود اٹھ بیٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ کمرے کی ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں مگر اس کی بیوی جو ہمیشہ اس سے پہلے جاگتی ہے ابھی تک سو رہی ہے اس کے سونے کا انداز عجیب سا ہے بال بکھرے ہوئے ہیں وہ بے سدھ سی پڑی

ہے۔وہ سو رہی ہے یا؟

خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔یہ یقین کرنے کے لئے کہ اس کی کھوپڑی سلامت ہے وہ آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو چھوتا ہے وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی ہے۔وہ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر مشکل سے اسے چپ کراتا ہے۔حواس درست ہونے پر وہ کہتی ہے:

''کیا بات ہے آپ مجھ پر اس طرح کیوں جھکے ہوئے تھے؟''

''کچھ نہیں۔ایسے ہی۔''

''ایسے ہی کیوں؟'' وہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

''بھئی میں۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔تمہاری زلفیں۔'' وہ بات ٹالنا چاہتا ہے۔

''آہستہ بولئے بچے جاگ جائیں گے۔'' وہ لجا کر کہتی ہے ''میں سمجھی تھی آپ میرا گلا۔''

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا ہے اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔



زوال سے پہلے

زمانے کی قسم انسان دراصل بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور آپس میں حق کی پیروی اور صبر کی تلقین کرتے رہے

(والعصر)

کیا دیکھتا ہوں کہ مسمار شدہ عمارات کا ملبہ دور دور تک بکھرا پڑا ہے' فضا دھوئیں اور بارود کی بو اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی ہے۔ ہریالی اور درخت جھلسے ہوئے ہیں اور چند عورتیں اور بچے جن کے لباس گرد آلود ہیں' ملبے سے پرانی اور استعمال شدہ اینٹیں نکال کر اور لکڑیوں کے ادھ جلے تختے جوڑ کر ایک چبوترا سا تیار کر رہے ہیں۔ پھر ایک بچہ کہیں سے لوہے کی دو ٹانگوں والی کرسی اٹھا لاتا اور عین درمیان میں رکھ دیتا ہے ایک دوسرا ٹوٹے ہوئے پایوں کے نیچے اینٹیں جوڑ دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسٹیج تیار کیا جا رہا ہو۔ شاید کوئی المیہ یا طربیہ کھیل شروع ہونے والا ہے۔

اسٹیج مکمل ہو جاتا ہے تو عورتیں اور بچے کچھ فاصلے پر اس طرف کو منہ کر کے جدھر سے سورج نکلتا ہے' کھڑے ہو جاتے ہیں اور کسی کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں بے آواز قدموں سے چلتا سفاک چہرے والا ایک بڑی عمر کا شخص نمودار ہوتا ہے۔ وہ بے نیازی سے گزر جانا چاہتا ہے مگر نڈھال' نظر آنے والی عورتیں اور ویران چہروں والے بچے اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ اور انصاف انصاف پکارتے ہیں۔ سفاک چہرے والا شخص چلتے چلتے رک کر انہیں دیکھتا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے تامل کرتا ہے۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سٹیج کی طرف آتا اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے نہایت شاہانہ انداز میں ہاتھوں سے تالی بجاتا ہے۔ تالی کی آواز دور تک گونجتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے ہر طرف سے آدمیوں کے دوڑ کر آنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور ذرا سی دیر میں مختلف عمروں کے بہت سے آدمی راکھ لتھڑے ہوئے چوں چوں کرتے چوزوں کی طرح آتے اور گردنیں جھکا کر اسٹیج کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک زرد رو بچہ اشارہ پا کر آگے بڑھتا ہے اور لوگوں اور سٹیج کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہتا ہے:

''کارروائی شروع ہوتی ہے۔''

کھسر پھسر کرتے لوگ خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھا جاتا ہے۔ بچہ پھر کہتا ہے۔

''عدالت جاننا چاہتی ہے کون ذمہ دار ہے۔''

سب لوگ نظریں نیچی کئے چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں کوئی جواب نہیں دیتا۔

''بولو۔۔۔۔۔۔۔جواب دو'' منصف کی رعب دار آواز گونجتی ہے۔

''سکوت اور گہرا ہو جاتا ہے گردنیں اور زبانیں جھک جاتی ہیں۔ سبھی سکڑ اور سمٹ کر خود کو ایک دوسرے کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عدالت کی معاونت کرنے والا بچہ اگلی قطار کے گرد و غبار میں اٹی پگڑیوں' کلاہوں' فیتوں' اچکنوں' سوٹوں' وردیوں اور مختلف لباسوں والے ایک ایک آدمی کے پاس جاتا۔ اور اس سے گردن اٹھا کر اپنا چہرہ عدالت کو دکھانے کے لئے کہتا ہے۔ ہر شخص اپنی باری آنے پر چہرہ اوپر اٹھاتا ہے۔ پھر نظریں اور گردن جھکا لیتا ہے۔ پہلی کے بعد دوسری۔ پھر تیسری' چوتھی' سبھی قطاروں کے لوگ اپنی اپنی جگہ مجرموں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ منہ سے کوئی کچھ نہیں بولتا۔

''عدالت جاننا چاہتی ہے' کون قصوروار ہے؟'' زرد رو بچہ ایک ایک کے پاس جا کر پوچھتا ہے۔ مگر کوئی جواب نہیں دیتا۔ مگر پھر سب سے آخر میں کھڑا زخمی چہرے والا شخص بول اٹھتا ہے اور اپنے قریب کھڑے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

''یہ ذمہ دار ہے۔''

ساتھ والا شخص ہڑبڑا جاتا ہے۔ مگر پھر سنبھل کر اپنے آگے کھڑے تیسرے شخص کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا ہے:

''یہ ذمہ دار ہے۔''

پھر تیسرا چوتھے کی طرف اور چوتھا پانچویں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر سبھی ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے لگتے ہیں پتہ نہیں چلتا کون کس کو قصوروار ٹھہرا رہا ہے۔

''خاموش خاموش'' اسٹیج سے گرجدار آواز سنائی دیتی ہے۔ سب سہم جاتے ہیں۔ اور گردنیں جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔'' آواز دوبارہ سنائی دیتی ہے۔

لوگوں میں پھر سے کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔ پھر درمیان کی کسی قطار سے کٹے ہوئے بازو والا ایک شخص آگے آتا ہے۔ اس نے پھٹی ہوئی آستینوں والا وکیلوں کا کوٹ پہنا ہوا ہے' وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے چہرے اور کپڑوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ جھک کر تعظیم کرتا اور کہتا ہے۔

''اجازت ہے؟''

''اجازت ہے۔''

''حضور وہ شخص جو اس کا ذمہ دار تھا اب ہم میں نہیں رہا۔''

''کیا ہوا اسے؟''

''جناب والا۔۔۔۔۔۔۔اس کو اپنے کئے کی سزا مل چکی ہے۔''

''کیا وہ اکیلا ہی ذمہ دار تھا؟''

''نہیں حضور۔۔۔۔۔۔۔اس کے بہت سے قریبی ساتھی اور معاون تھے۔''

''ان سب کو پیش کیا جائے۔''

''حضور ان کو بھی سزا مل چکی ہے۔''

اسی لمحے لوگوں کے عقب سے ہانپتی کانپتی کاغذوں کا پلندہ اٹھائے درمیانی عمر کی ایک عورت آتی ہے۔اور لوگوں کے درمیان سے گزر کر عدالت کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔اور آداب بجالاتی ہے۔

''تم پھر دیر سے آئی ہو؟'' عدالت اسے تنبیہ کرتی ہے۔

''میں معافی چاہتی ہوں جناب والا۔ مجھے روزنامچہ مکمل کرنے میں دیر ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔دراصل میرے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے حضور مجھے دیر ہوجاتی ہے۔''

عدالت کو بتایا گیا ہے کہ اصل مجرم اور اس کے ساتھ اپنے کئے کی سزا پاچکے ہیں اگر تمہیں کچھ نہ کہنا ہو تو فیصلہ سنایا جائے۔''

''مجھے بہت کچھ کہنا ہے عالی جاہ۔'' وہ کہتی ہے۔''میں موقع کی عینی شاہد ہوں۔''

''اجازت ہے۔''

''یہ درست ہے جناب والا'' وہ ٹھہر ٹھہر کر باوقار انداز میں کہتی ہے۔''اصل مجرم اور اس کے معاون سزا پاچکے ہیں۔لیکن یہ سب لوگ جو آپ کے سامنے حاضر ہیں اس سنگین جرم میں شریک رہے ہیں۔''

ہجوم میں بے چینی پھیل جاتی ہے۔آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔۔ہم مجرم نہیں ہیں۔''

''ہم بے قصور ہیں۔''

ہم بے گناہ ہیں۔"

"خاموش خاموش۔"

"حضور والا حقیقت یہ ہے" یہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے۔" جو کچھ ہوا ان سب کے سامنے ہوا۔ اگر یہ چاہتے اور کوشش کرتے تو اس کا تدارک کر سکتے تھے۔ میرے پاس اس کے بہت سے شواہد ہیں کہ یہ سب بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ان کو بھی کڑی سزا ملنی چاہئے۔"

وکیل صفائی لمحہ بھر کے لئے سر کھجاتا ہے۔ پھر عدالت سے مخاطب ہوتا ہے۔" یہ درست ہے جناب عالی کہ جرم کو ہوتے ہوئے دیکھنا اور اس کا تدارک نہ کرنا غلفت ہے لیکن"

"مجرمانہ غفلت" وہ ٹوکتی ہے۔

"لیکن نہتا آدمی" وکیل صفائی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے" خواہ کتنا ہی بیدار، دانشمند اور دور اندیش کیوں نہ ہو مسلح آدمی کو جرم کے ارتکاب سے روکنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ ایک یا چند مسلح اشخاص نے بہت سے نہتے آدمیوں کو زیر کیا۔ انہیں اپنا ہم خیال اور غلام بنایا ان سے سب کچھ چھین لیا۔ ان کا مال اسباب، زمینیں، عورتیں اور بعض اوقات عقیدے اور ان پر طویل عرصے تک حکمرانی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مفتوح بھول گئے کہ وہ کون اور کیا تھے اور کبھی وہ آزادی اور فارغ البال بھی تھے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میرے موکلین جن میں میں خود بھی شامل ہوں بے قصور ہیں۔ وہ اگر چاہتے بھی تو حماقتوں اور غلطیوں کے ارتکاب کو نہیں روک سکتے تھے۔ البتہ وہ غفلت اور کوتاہی کے ضرور مرتکب ہوئے ہیں اور اس کی سزا بھی پا رہے ہیں۔ لیکن وہ مجرم نہیں ہیں۔"

"حضور۔۔۔۔۔۔ میں موقع کی گواہ ہوں۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کی کارگزاری کی پوری تفصیل قلمبند کر رکھی ہے۔ یہ محض تماشائی نہ تھے بلکہ انہوں نے اس ٹریجڈی میں خود کو چھوٹے موٹے مختلف رول ادا کئے ہیں۔ یہ محض غفلت کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اعمال و افعال سے تباہی کے اسباب مہیا کئے۔ اگر یہ باہمی نفاق و انتشار اور مصلحتوں سے کام نہ لیتے تو یہ المیہ کبھی پیش نہ آتا۔ حضور والا کوئی واقعہ اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتا اس کے اسباب و علل پہلے سے وجود میں آ چکے ہوتے ہیں۔ انہوں نے سچ بولنا اور سننا ترک کر دیا تھا۔ سچائی ان کے دروازوں پر بار بار دستک دیتی مگر یہ ہر بار اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے۔ ہوا ایک عرصہ سے ان کے درختوں سے سر ٹکرا رہی تھی مگر انہوں نے اس کی سسکیوں پر کان نہ دھرا۔ بادلوں نے بہت

عرصہ پہلے ان کے کھیتوں پر برسنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر انہوں نے دعا تک کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے موسموں میں ان کی آنکھوں کے سامنے تغیر ہوا سورج نے دیر سے نکلنا اور جلدی ڈوبنا شروع کر دیا مگر یہ بے خبر وقتی لذتوں میں کھوئے رہے۔ ان کے نعمت خانوں اور اناج سے بھرے گوداموں کے باہر فاقہ زدہ لوگ اور ان کے ڈرگ اسٹورز اور دوا خانوں کے باہر مریض دوا نہ ملنے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے تھے۔ مگر ان کے دل نہ پسیجتے تھے۔ میں ان کو برابر بتاتی رہی کہ ان سے پہلے ایسا کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا رہا ہے۔ مگر میری کسک بات پر انہوں نے دھیان نہ دیا۔ میری درخواست ہے کہ ان سب سے نہ صرف باز پرس کی جائے بلکہ انہیں ان کی مجرمنہ غفلتوں اور عاقبت نااندیشوں کی سخت سزا دی جائے۔''

''آپ کو مزید کچھ کہنا ہے؟'' عدالت وکیل صفائی سے پوچھتی ہے۔

''جی جناب عالی'' وکیل صفائی کہتا ہے ''میرے موکلین میں ہر شعبے اور پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ان میں لیڈر ہیں جو برابر لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے لئے انہوں نے قید و بند کی سختیاں تک جھیلیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ ان میں علمائے دین ہیں جو گناہوں اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے رہے۔ اور لوگوں کو برابر نیکی اور راست بازی کی طرف بلاتے رہے۔ ان میں دانشور اور ادیب ہیں جو اپنے خون جگر سے کام لے کر اعلیٰ اقدار کے فروغ و تحفظ کے لئے کوشاں رہے۔ ان می باضمیر صحافی ہیں جو لوگوں کو اچھے اور برے حالات سے باخبر اور نتائج سے آگاہ کرتے رہے۔''

''مجھے تسلیم ہے جناب والا'' وہ کہتی ہے ''سب لوگ ایک جیسے نہیں تھے۔ ان میں بعض محنتی مخلص نڈر اور راست باز بھی تھے۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ افسوس ایسے لوگ اپنوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے۔ بدقسمتی سے خود غرض' ریا کار اور نااہل لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اجتماعی معاملات اور مسائل کی بجائے' ہر کسی کو اپنے ذاتی مفادات اور اپنے اعزہ و اقربا کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ لوگ حالات کے مطابق سانچوں میں ڈھل جاتے اور اپنے موقف میں لچک اور تبدیلی پیدا کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ جھکنا نہیں ٹوٹنا جانتے تھے۔ وہ ٹوٹ گئے اور جھکنے والے اب تک بے غیرتی سے جیتے چلے جاتے ہیں۔ حضور والا ان کے عالموں کا یہ حال تھا کہ وہ علم کے نام سے بدکتے بلکہ نئی سوچ' نظریات اور علمی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ انہوں نے سوچنا' سوال کرنا' شک اور انکار کرنا چھوڑ دیا تھا جو علم کی اولین شرط ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے ذہن کند اور زنگ آلود ہوتے چلے گئے۔ ان کے تلاش و تحقیق کے جذبے ماند پڑ گئے اور ایجاد و تخلیق کے سوتے خشک ہو گئے۔ ان کے مذہبی رہنما طبوں میں بٹے ہوئے لوگوں کو فرقہ ورانہ منافرت پھیلا کر مزید گروہوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ ان کے دانشور اور شاعر و ادیب اہل اقتدار کے

مفادات کا تحفظ کرتے ان کے قصیدے لکھتے اور ان کی خوبیوں کے جو ان میں موجود نہ ہوتیں گن گاتے اور انعام و اکرام پاتے تھے۔ انہوں نے عام لوگوں کی زبان کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی کوڈز کے ذریعے اپنی ایک علیحدہ اور خاص زبان ایجاد کر لی تھی جسے دوسرے لوگ انہیں سمجھ سکتے تھے۔ خیالی حسیناؤں سے ہم کلامی اور مباشرت ان کی شاعری کا اہم ترین موضوع تھا۔ فن اور ادب محض ذاتی شہرت اور دولت کمانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا تھا۔ جہاں تک صحافت کا تعلق ہے یہ اس دور کی سب سے بڑی تجارت تھی۔ سچائی کو چھپایا جاتا تھا۔ اور لوگوں کو جھوٹے، من گھڑت اور سنسنی خیز واقعات کی طرف راغب کیا جاتا تھا۔ کلمہ حق کہنے کے لئے جابر سلاطین کے اقتدار سے ہٹنے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں میرے ریکارڈ میں اتنے بہت سے واقعات ہیں کہ ان کے بیان کرنے کے کئی دفتر درکار ہوں گے۔ مگر میں فاضل عدالت کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتی۔ صرف اتنا عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ان کے سبھی اداروں کی اخلاقی حالت زوال آمادہ تھی۔ جس کے ہاتھ میں طاقت اور روپیہ آ جاتا تھا وہ معزز اور طاقتور بن جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر یہ گلی میں پہرہ دینے کے لئے چوکیدار کے ہاتھ میں لاٹھی یا بندوق تھماتے تھے وہ غنڈہ ٹیکس وصول کرتا یا لوٹ مار کرنے لگتا تھا۔ اور ان کی پولیس! سچی بات تو یہ ہے جناب والا کہ خود مجھے اس سے ڈر لگتا رہا ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ میرے کاغذات بھی گم کر دیئے۔ یا چھین کر ان میں ردو بدل کر دیا۔"

"حضور میں احتجاج کرتا ہوں" وکیل صفائی جوش سے کہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ "جناب والا معزز گواہ ایسی ذاتی اور انفرادی مثالوں سے میرے تمام موکلین کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتیں۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے معزز اور مخلص لوگ بھی شامل ہیں جو محنت سے کام کرتے رہے اور اپنی ذمہ داریاں دیانتداری سے نبھاتے رہے۔ اگر معزز گواہ کے کاغذات گم ہوئے ہیں یا ان میں ردو بدل ہوا ہے تو مجھے اس کا افسوس ہے لیکن"

"جناب والا" وہ وکیل صائی کی بات کاٹ کر کہتی ہے۔ "یہ میرے کاغذات نہیں تھے۔ اور پھر وکیل صفائی کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اپنے مسودے ایسی جگہوں محفوظ کر دیتی ہوں جہاں۔۔۔۔۔۔۔ کسی اچکے کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ میری تحریری اتنی آسانی سے مٹائی یا تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔ وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہیں صدیوں بعد بھی آپ کو چٹانوں پر کندہ اور غاروں میں محفوظ ملیں گی۔"

معزز گواہ خود ستائی پر اتر آئی ہیں جناب والا۔ ان باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"بہت زیادہ تعلق ہے حضور۔"

''عدالت تمہاری خوبیوں سے واقف ہے اور اس کی معترف ہے۔ آگے چلو اور اختصار سے کام لو۔''

''میں معافی چاہتی ہوں عالی جاہ۔ میں کوشش کروں گی۔ فاضل عدالت کا زیادہ وقت نہ لوں۔ حقیقت یہ ہے جناب والا کہ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ لوٹ کھسوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے روزمرہ معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ دھوکا کرتے اور نفرتوں کے بیج بوتے تھے۔ ملاوٹ' منافقت اور ناانصافی ان کے معمولات زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔ ایک دوسرے کا اعتماد کھو کر یہ اپنی اپنی جگہ زوال اور تباہی کو آوازیں دیتے تھے۔ ان سے پوچھا جائے کہ ان کے وہ عالی شان محل اور بنگلے اب کہاں ہیں جن کے حصول کے لئے انہوں نے ایک دوسرے کی حق تلفیاں کیں ان کی وہ دولت کیا ہوئی جو انہوں نے ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کر یا دھوکا دہی کے ذریعے حاصل کی تھی اور ان کی عشرت گاہیں اب کہاں ہیں جہاں کسی مظلوم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ افسوس انہوں نے میری کسی بات پر عمل نہ کیا اور برباد ہوئے۔ میرے درخواست ہے کہ ان کو عبرتناک سزا ملنی چاہئے۔''

لوگوں میں پھر کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔ وکیل صفائی سر کھجاتا ہے' عدالت کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

''میرے موکلین اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں پر شرمندہ ہیں اور فاضل عدالت سے رحم کی اپیل کرتے ہیں۔''

''انصاف انصاف'' اسٹیج کی اطراف سے عورتوں اور بچوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔''

''عدالت عینی شاہد کے بیانات سن کر اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ تمام بالغ لوگ کسی نہ کسی طرح جرم میں شریک رہے ہیں اور مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں عدالت انہیں اسی حال میں رہنے کی سزا سناتی ہے۔''

''رحم۔۔۔۔۔۔۔رحم۔۔۔۔۔۔۔حضور۔۔۔۔۔۔۔رحم۔''

''عدالت برخاست کی جاتی ہے۔''

سفاک چہرے والا بوڑھا منصف اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک طرف کو چل دیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسی لمحے بگل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سرخ وردیواروں میں ملبوس سپاہی ہاتھوں میں ہنٹر لئے چاروں طرف سے انہیں گھیر لیتے ہیں پھر ان میں سے ایک آگے بڑھ کر کہتا ہے:

''یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔الو کے پٹھو۔۔۔۔۔۔۔اپنے کام پر چلو۔''

سب لوگ کدالیں اور بیلچے لے کر ملبہ ہٹانے میں لگ جاتے ہیں۔

میری آنکھ کھل جاتی ہے۔



دیکھا ہوا منظر

ہوا چلتی تھی۔ سورج چمکتا تھا۔ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصے میں پڑا اہانپتا رہتا تھا۔

گھاس اُگتی تھی۔ بیلیں پھیلتی تھیں۔ پیڑ بڑھتے تھے۔ بور آتا تھا۔ پھول کھلتے تھے' چڑیا چہچہاتی تھیں۔ کوئل کوکتی تھیں۔ بادبرستے تھے۔ چاندنی چٹکتی تھی۔ ڈھول بجتے تھے اور میں پنگوڑے میں لیٹا نئے نئے الفاظ سیکھنے کی مشق کرتا تھا۔

ایک روانہوں نے کہا" مان"

لیکن اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی یوں کہ اس وقت میری اپنی کوئی مرضی یا پسند نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کیا مان رہا ہوں اور کس بات کا اقرار کر رہا ہوں اور اس ماننے اور اقرار کر لینے کے علاوہ بھی کوئی صورت ہوتی ہے مثلاً انکار۔

پھر انہوں نے کہا" پڑھ اور جان"

میں اگر چہ اس قابل نہیں تھا کہ جان سکتا وہ مجھے کیوں اور کیا پڑھانا چاہتے تھے اور مجھے کیا پڑھنا اور کیا نہیں پڑھنا چاہئے تھا' پھر بھی میں نے اپنی فطری تساہل پسندی کی وجہ سے چاہا کہ نہ پڑھوں۔ مگر انہوں نے مجھے بہلایا' پھسلایا' ڈرایا' دھمکایا اور بعض اوقات مارا پیٹا۔۔۔۔۔۔ اور مجھے پڑھنا پڑا۔ وہی کچھ جو وہ چاہتے تھے۔ جو کچھ وہ جانتے تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے خود پڑھا تھا۔ اور میں وہ سب کچھ نہ پڑھ سکا جو انہوں نے نہیں پڑھا تھا اور جس کو وہ نہیں جانتے اور مانتے تھے۔ اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ لیکن اب باتوں کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

پھر انہوں نے کہا کہ" غور کر۔"

اور میں نے سوچنا شروع کیا اور میرا خیال ہے کہ یہیں سے خرابی پیدا ہوئی۔ میں سوچتا رہتا۔ جو کچھ مجھے بتایا اور پڑھایا جاتا۔ اس پر غور کرتا۔ مین میخ نکالتا۔ ایسا کیوں ہے؟ ویسا کیوں ہے؟ بعض اوقات مجھے شبہ ہونے لگتا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہو۔ پتہ نہیں مجھ سے کچھ چھپایا جاتا تھا یا ان کی معلومات ناکافی تھیں۔ وہ میرے سوالوں پر تسلی بخش جواب نہ دیتے۔ رفتہ رفتہ مجھے ان کی باتوں اور ان کی کتابوں میں جو وہ مجھے پڑھاتے تھے غلطیاں نظر آنیلگیں جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے۔ ان کتابوں میں بعض سوالوں کے جواب غیر تسلی بخش تھے۔ بوض سوالوں کے جواب سرے سے درج ہی نہیں تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ میں جس قدر سوچتا ذہن

میں دھند پھیلنے لگتی۔ ذہن میں جس قدر دھند پھیلتی اس قدر جبس بڑھتا اور سوالوں کی نئی نئی کھمبیاں اگنے لگتیں۔ تب مجھے یہ پتہ بھی چلا کہ ان کتابوں میں بعض سوالات بھی موجود نہیں تھے۔ میں ان سے پوچھتا تو وہ ٹال دیتے اصرار کرتا تو برا مانتے۔ غیر متعلق سوالوں اور نصاب سے خارج باتوں پر سوچنے اور گفتگو کرنے سے منع کرتے۔ سوچنا میرے بس میں تھا میں سوچتا۔ نہ سوچنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں ان کے منع کرنے کے باوجود نصاب سے خارج باتوں پر غیر متعلقہ سوالوں کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ پتہ نہیں یہ عادت مجھے کیسے پڑ گئی تھی۔

اپنے سوالوں کے تسلی بخش جوابات نہ پا کر میرے دل میں مزید سوالات کلبلانے لگے۔۔۔۔۔۔۔ شکوک سر ابھارنے لگے اور شبہات پانے سے نکل کر پاؤں پاؤں چلنے لگے۔ بعض اوقات مجھے لگتا میں بھتنوں کے طلسماتی لشکر میں گھر گیا ہوں۔ اور میرے اپنے تیر پلٹ کر مجھے ہی گھائل کر رہے ہیں اور کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ میں نے ان سے مدد چاہی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں نے ان کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے اور سوچ کی معین حدوں سے تجاوز کیا ہے۔ اس لئے وہ میری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ سوچنا کس قدر اذیت ناک اور سوچ کو کسی مقررہ دائرے تک محدود رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوسرے لوگ ایسی صورت میں کیا کرتے تھے۔ میری سمجھ میں تو یہی آیا کہ بھاگ جاؤں شہر چھوڑ دوں اور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں سوچنے کی آزادی ہو۔ کیا پتہ دوسری جگہ ذہنی فضا مختلف ہو وہاں جا کر مجھے اپنے سوالوں کے جواب بھی مل جائیں اور میں ایک عظیم فاتح کی طرح سرخرو ہو کر لوٹوں۔

اور میں نے ہجرت کی کہ پیغمبروں کی سنت بھی تھی اور ایک اجنبی شہر میں پناہ لی اس نئے شہر کے لوگ بظاہر پہلے شہر والوں سے مختلف نہ تھے۔ مگر ان کی زبان اور کتابیں مختلف تھیں۔ اس امکان کے پیش نظر کہ شاید ان کے یہاں مجھے بعض اہم سوالوں کے جواب مل جائیں میں نے ان کی زبان سیکھی اور ان کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن جلد ہی مجھے یہ معلوم کر کے پریشانی سے دو چار ہونا پڑا کہ ان کی سوچ بھی زیدہ مختلف نہیں تھی چنانچہ مجھے اپنے کسی ذسوال کا جواب نہ مل سکا اور آخر کار مجھے یہاں سے بھی رخصت ہونا پڑا۔

اس کے بعد میں نگر نگر گھوما۔

کئی طرح کی زبانیں سیکھیں اور کتابیں پڑھیں۔ لیکن مجھے اپنے سوالوں کے تسلی بخش خوابات کہیں سے حاصل نہ ہوئے۔ ہر جگہ لوگ ایک ہی طرح سوچتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کی کتابوں کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ صرف اپنی معلومات کو مکمل اور سچ قرار دیتے تھے۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ سچ کیا تھا؟ کہیں تھا بھی یا نہیں؟ میں اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

کتابوں سے مایوس ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ ارضی علم سے قطع نظر کر کے آسمان سے براہ راست لو لگاؤں اور اپنی حسیات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے باطن سے سوالوں کے جوابات حاصل کروں چنانچہ میں نے دنیا تیاگ دی اور انسانی بستیوں سے دور ایک ویرانے میں ٹھکانہ کر لیا۔

میں ایک مدت تک پہاڑ کی ایک کھوہ میں پناہ لے کر گریان حاصل کرنیکے لئے ریاضت کرتا رہا۔

میں نے خود کو بہت سی اذیتیں دیں۔

آہستہ آہستہ میرا ماس جھڑنے لگا۔ اور ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔

میں نے اپنے اندر کی روشنی کے لئے اپنے باہر کو ایندھن بنا کر جلایا۔ اور بہت سے روحنی مدارج طے کئے۔ لیکن ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجھے وہ آواز سنائی نہ دی جس کا مجھے انطار تھا۔ کوئی روشنی نظر نہ آئی۔ نہ کوئی صحیفہ مجھ پر نازل ہوا۔ مایوسی میرے اندر بلکنے لگی اور نا امید ہو کر میں نے دوبارہ درختوں کے پتے اور کچے پکے پھل کھانا شروع کر دیئے۔ اور آہستہ آہستہ میری ننگی ہڈیوں پر ماس کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

پر ہ اچانک ایک روز مجھے خیال آیا کہ شاید میں اب تک غلط راستوں پر بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے کسی راہبر کسی مرشد سے جو صحیح اور غلط راستوں کی کامل پہچان رکھتا ہو کبھی رجوع نہیں کیا۔ جونہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں نے مرشد کی تلاش شروع کر دی۔ مگر یہ سب سے مشکل کام نکلا۔ ہر کسی کا تقاضا تھا کہ میں سوچنا چھوڑ دوں اور خود کو اس کے حوالے کر دوں۔ میں سوچنا ترک کرنا اور خود کو کسی کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں میرے اندر کیسی بھٹی سی دہکتی رہتی تھی جس سے ہر آن سوالات دھوئیں کی مانند بلند ہوتے اور ماحول کو آلودہ کرتے رہتے تھے۔ میں نے خود کو باری باری بہت سے لوگوں کے حوالے کیا۔ جو راہبری کے دعویدار تھے۔ لیکن چونکہ میں نے سوچنا ترک نہیں کیا تھا' اس لئے مجھے ان کی صحبت سے محروم ہونا پڑ جاتا۔

لیکن پھر ایسا ہوا کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنی سپردگی میں لئے بغیر میرے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دینا شروع کئے۔

طمانیت سے میرا اندر بھرنے لگا۔

مجھے ایسے لگا جیسے میرے دل سے ایک کانٹا سا نکل گیا ہو۔ جیسے میرے وجود سے پتھروں کا انبار ہٹا دیا گیا ہو۔

ایک ایک کر کے میری ساتی گتھیاں سلجھنے اور پہلیاں حل ہونے لگیں اور مطلق سچ کی آگہی سے میرا اندر باہر منور ہو گیا۔

میں بہت خوش تھا۔ مجھے میر کھوئی ہوئی منزل مل گئی تھی۔ میں گھر واپس روانہ ہوا کہ اہل شہر کو مژدہ سناؤں۔ انہیں بتاؤں کہ سچ کیا ہے۔ اور اس تک رسائی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن جونہی شہر میں داخل ہوا' ہر طرف شور مچ گیا۔

''پھر آ گیا ہے۔''

''وہی ہے۔ وہی ہے۔''

''لوگ میے چاروں طرف جمع ہونے لگے۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھتے۔ انگلیاں اٹھاتے' خوفزدہ ہوکر دور بھاگتے۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔

پھر اچانک ننگی تلواریں لئے سپاہیوں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیوں اور کیا تھا۔ لوگوں کا ہجوم ہر آن بڑھتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا سارا شہر امڈ پڑا ہے اور ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے شہر کے وسط میں اس چبوترے کے قریب لے گئے جہاں سولی گڑی تھی لیکن میرا جرم؟ میں نے تو ابھی سچ یا جھوٹ کچھ بھی نہیں کہا تھا صرف سوچا تھا۔

چبوترے پر کھڑے ہوکر میں نے ایک نگاہ انسانوں کے اس سمندر پر ڈالی جو چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہر سو سر ہی سر تھے۔ اور شور مچا ہوا تھا۔

''وہی ہے۔۔۔۔۔۔۔ بالکل وہی ہے۔''

اچانک مجھے یاد آیا یہ منظر میں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے۔ کب اور کہاں؟ میں ابھی یاد کر رہا تھا کہ انہوں نے میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی اور میری گردن میں پھندا ڈال دیا۔

ہوا چلتی ہے۔ سورج چمکتا ہے۔ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصے میں پڑا اپنا پتار ہتا ہے۔

گھاس اگتی ہے۔ بیلیں پھیلتی ہیں۔ پیڑ بڑھتے ہیں۔ بور آتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ بادل برستے ہیں۔ چاند چمکتی ہے۔ ڈھول بجتے ہیں اور میں پنگوڑے میں لیٹا نئے نئے الفاظ سیکھنے کی مشق کرتا ہوں۔



بچے اور بارود

''بی بی آپ کا نام؟''

''کیا کہا بیٹی' ذرا بلند آواز میں کہو۔''

''کیا آپ اونچا سنتی ہیں؟''

''ہاں بیٹی۔۔۔۔۔۔۔بہت اونچا سننے لگی ہوں۔''

''کیا پہلے ٹھیک سنائی دیتا تھا؟''

''ہاں ساری آوازیں سن لیتی تھی۔ جہاں ہمارا گھر تھا' وہاں بہت درخت تھے۔ درختوں پر سارا دن کبوتر کوے' فاختائیں' چڑیا اور توتے بولتے رہتے۔ ان کی رنگارنگ آوازوں سے عجیب سماں بندھا رہتا۔ ہمارے گھر کے پاس ایک آبشار تھی بارہ مہینے بہتی رہتی۔ جب بھی پیچھے پہاڑوں پر بارش ہوتی یا برف پگھلتی اس کا شور بڑھ جاتا۔ میں روٹی پکاتی جھاڑو دیتی۔ بکری دوہتی اس کی آواز سنتی رہتی' اس کی آواز میں ذرا بھی تبدیلی آتی تو مجھے گھر بیٹھے پتہ چل جاتا کہ پانی کا کتنا بڑا ریلا آیا ہے۔ میرا مرد کھیتوں میں ہل چلاتا تو مجھے اس کی آہٹ سے پتہ چلتا رہتا۔ اب وہ کھیت کے کس حصے میں ہے۔ وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا تو مجھے گھر بیٹھے اس کلہاڑے کی آواز سے اندازہ ہوتا رہتا۔ اب وہ تھک گیا ہے اور اسے قہوے کی ضرورت ہے۔ رات کو گھر میں کہیں چوہا حرکت کرتا تو میری آنکھ کھل جاتی۔ میرا بیٹا کبھی کبھی مجھے تنگ کرنے کے لئے دبے پاؤں آتا اور اچانک ''ہو'' کہہ کر ڈرانا چاہتا۔ تم جانتی ہو بیٹی ماں کا دل تو بچے کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اس کا ہر پاؤں میرے دل پر پڑتا مجھے اس کے آنے کا اندازہ ہو جاتا۔ مگر میں اس کا دل رکھنے کے لئے جھوٹ موٹ ڈر جاتی جس پر وہ خوش ہو کر زور زور سے ہنسنے لگتا۔

''آپ کب سے اونچا سننے لگی ہیں؟''

''اب تو بہت دن ہو گئے بیٹی۔ دھماکوں کی آوازیں سن سن کر کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے۔ سننے کے لئے اب رہ ہی کیا گیا ہے۔''

''کیا آپ کو یاد ہے لڑائی کب اور کیسے شروع ہوئی تھی؟''

''مجھے تو اتنا یاد ہے بیٹی! ہم امن چین سے رہتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا گھر تھا۔ تھوڑے سے کھیت تھے مگر ہم خوش اور مطمئن تھے۔ اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا دیا تھا۔ ہمارے پاد دو گدھے تین بیل بیس بکریاں اور بہت سی مرغیاں تھیں۔ ہاں ایک بلی بھی تھی۔ بڑی پیاری میرے بیٹے سے بڑی مانوس تھی۔ رات کو اکثر اس کے بستر گھس کر سوجاتی۔ ایک بار۔۔۔۔۔۔۔''

''آپ جنگ کے بارے میں بتا رہی تھیں۔''

''ہاں بیٹی میں نے بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ ہماری کسی سے لڑائی نہ دشمنی اگر ہمارا کوئی جانور کسی دوسرے کھیتوں میں چلا جاتا تو ہم معافی مانگ لیتے کسی دوسرے کا مویشی ہمارے کھیت میں گھس آتا تو ہم معاف کر دیتے۔ کوئی اور تنازعہ ہوتا تو ہم مل بیٹھ کر نپٹا لیتے۔ ہم اپنی اور اپنے بچوں کی ہی نہیں سب کے مال وعیال کی خیر چاہتے تھے۔ کسی دوسرے کو خوش اور خوشحال دیکھ کر حسد کی آگ میں نہیں جلتے تھے۔ ہم نے لڑائی جھگڑے اور دشمنی کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔ لیکن یہ لڑائی۔۔۔۔۔۔۔؟ یہ تو بیٹی باہر سے آئی' کہیں اوپر سے نازل ہوئی پتہ نہیں اس کے کیا اسباب تھے۔ کون سچا تھا اور کون جھاوٹا تھا کون حق پر تھا اور کون گہنگار۔ ہم غریب لوگوں کو کیا معلوم بس ہمیں تو اتنا پتہ ہے بیٹی ایک دن دھماکے کی آواز سنائی دی اور سارے پنچھی دانا دنکا چگنا اور چہچہانا بھول گئے۔ فضا میں شگوفوں کی خوشبو کی جگہ بارود کی بو پھیل گئی۔ اس سے پہلے بھی ہوائی جہاز گزرتا تھا۔ تو میرا بیٹا بھاگ کر کسی ٹیلے یا چھت پر چڑھ جاتا اور اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ مگر دھماکوں کی آواز سن کر اور یہ جان کر کہ یہ دھماکے ہوائی جہازوں نے اگلے ہیں وہ سہم گیا اور ہوائی جہاز کی آواز سن کر بدکنے لگا۔ بھاگ کر سب سے پہلے ان خندقوں میں گھس جاتا جو ہم نے بڑے بوڑھوں ک ہدایت پر گھروں کے قریب کھود لی تھیں۔

''سنا ہے آپ کے میاں نے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی۔''

''میں سمجھی نہیں بیٹی۔ اونچا بولو۔''

''آپ کے میاں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔''

''اچھا اچھا۔۔۔۔۔۔۔ بس بیٹی اچھا آدمی تھا محنتی اور ایماندار اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ بیٹے سے اسے بہت محبت تھی کام کاج سے لوٹتا سب سے پہلے اسی کا پوچھتا۔ چوم چوم کر اس کے گال سرخ کر دیتا۔ کہتا تھا اسے پیار کر کے ساری تھکاوٹ اتر جاتی ہے۔ وہ اسے پڑھانا لکھانا چاہتا تھا۔ اسے بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ جب وہ پانچ سال کا ہوا تو ہم نے اسے بڑے گاؤں کے سکول میں داخل کر دیا۔ شروع شروع میں وہ خود اسے کندھوں پر بٹھا کر سکول لاتا اور لے جاتا تھا۔ پھر وہ ہم عمروں کے ساتھ خود آنے جانے لگا۔ مگر اسے اس کی بڑی فکر رہتی۔ ذرا دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتا۔ بچوں سے تو سبھی محبت کرتے ہیں بیٹی مگر میرا میاں تو جیسے اپنے بیٹے کا عاشق تھا۔

وہ تھا بھی بڑا خوبصورت' بھولا بھالا اور پیارا۔ مگر اچھی چیزیں برے لوگوں کے پاس زیادہ دیر کہاں رہتی ہیں۔ ہم برے تھے بیٹی کیوں کہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ اسے تو ہمارے گھر میں پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ تو شکل وصورت سے ہی کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا وہ کسی دوسری قوم' قبیلے یا ملک میں پیدا ہو جاتا۔

میں آپ کے میاں کی شہادت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

"ہاں بیٹی ۔۔۔۔۔۔ وہ شہید ہو گیا۔ شہید ہی سمجھو جب لڑائی طول پکڑ گئی اور آدمیوں کی کمی ہو گئی تو اسے بھی پکڑ کر لے گئے۔ مگر اسے ہل چلانا آتا تھا بندوق نہیں اور لڑائی جھگڑے سے تو اسے بہت ہی وحشت ہوتی تھی۔"

"مگر میں نے سنا ہے اس نے نہایت جرات کا مظاہرہ کیا اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر دشمن کے ٹھکانے میں گھس گیا۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے بیٹی۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔"

"آپ نے اتنا عرصہ اس کے ساتھ گزارا ہے۔ آپ کچھ اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

"میں کیا بتا سکتی ہوں بیٹی۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ میں تو اسے اس حیثیت سے جانتی تھی کہ اس نے کبھی چیونٹی تک کو ہلاک نہیں کیا۔ میں نے تو اسے کبھی کسی مویشی کو مارتے پیٹتے بھی نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے بھرتی کے بعد اس میں تبدیلی آ گئی ہو لیکن مجھے اتنا ضرور یقین ہے وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے محبوب بیٹے کو چھوڑ کر کیسے مر سکتا تھا؟"

"تو کیا اس وقت آپ کا بیٹا زندہ تھا؟"

"ہاں ۔۔۔۔۔۔ اس وقت وہ بالکل سلامت تھا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے' جب جوان آدمی نہیں ملتے تھے۔ اور بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو بھرتی کیا گیا۔"

"کیا آپ کے بیٹے کو بھی بھرتی کیا گیا تھا؟"

"بھرتی ہی سمجھو بیٹی ۔۔۔۔۔۔ ایک دن سکول سے واپس آیا تو کہنے لگا کہ اگلے روز اس کے اسکول کا معائنہ کرنے بڑے افسر آ رہے ہیں۔ اس لئے استاد نے ہدایت کی ہے کہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آنا۔ میں نے اس کی حجامت بنوائی۔ ناخن کاٹے' نہلایا' دھلایا' اس کے سر میں خوشبودار تیل لگایا اور اچھے اچھے کپڑے پہنا کر رخصت کیا۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں اسے کبھی نہ جانے دیتی۔ اسے لے کر کہیں دور چلی جاتی کسی غار میں پناہ لیتی پاتال میں چھپ جاتی۔"

"اچھا تو وہ سکول سے واپس نہ آیا؟"

ایک وہی نہیں اور بھی بہت سے بچے واپس نہیں آئے میں نے بتایا نا۔۔۔۔۔۔۔جوان آدمیوں کی سخت کمی ہو گئی تھی۔انہوں نے بوڑھوں عورتوں اور بچوں سے یہ کمی پوری کرنا چاہی۔"

"کیا بچے بھی بندوقیں چلاتے تھے؟"

"ان کے ذمے اور طرح کے کئی کام تھے۔بندوقچیوں کو اسلحہ بارود فراہم کرنا۔ان کا سامان اٹھانا۔دشمن کی نقل و حرکت کی خبر دینا اور خبر رسانی کرنا۔لیکن میرا بچہ"

"آپ کے بچے کی کیا ڈیوٹی تھی؟"

"دشمن جس علاقے سے پسپا ہوا تھا' وہاں اس نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں۔باقاعدہ فوج آگے بڑھنے سے پہلے بچوں کو آگے بھیج کر معلوم کرتی تھی کہ وہاں بارودی سرنگیں تو نہیں ہیں' میرے بیٹے کا ایک ساتھی جو بری طرح زخمی ہو گیا تھا بتاتا تھا کہ ان کی ریس لگوائی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ جو چکر لگا کر پہلے واپس آئے گا۔اسے انعام دیا جائے گا۔اور وہ اس بات سے بے خبر کہ وہ زمین جو ان کے لئے پھل پھول اور اناج اگاتی تھی'اس میں بارود بو دیا گیا تھا۔بھاگتے رہے' میرا بیٹا بہت تیز دوڑتا تھا۔ہمیشہ دوڑوں میں اول آتا تھا۔وہ اس روز بھی آگے نکل گیا اور ساری سرحدیں پار کر گیا۔"

"مجھے آپ کے دکھ کا اندازہ ہے۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہو سکتا ہے بیٹی' کسی کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔صرف وہی ماں میرا دکھ جان سکتی ہے جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور اسے بارودی سرنگوں سے اٹی زمین پر دوڑایا جا رہا ہو۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں' لیکن ہم سب بارودی سرنگوں پر چل پھر رہے ہیں۔پتہ نہیں کب کون بھک سے اڑ جائے۔اچھا آپ کا بہت شکریہ۔کیا آپ بہنوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔۔میری دنیا کی تمام بہنوں سے اپیل ہے کہ جب تک پہلے جنے ہوئے خونریزیوں سے باز نہ آجائیں بچے پیدا کرنا چھوڑ دیں۔"

◆◆◆